اُردو اَفسانہ

پروفیسر ابن کنول

شعبۂ اردو

دہلی یونیورسٹی، دہلی

کِتابی دُنیا دہلی

اُردو اَفسانہ

پروفیسر ابن کنول

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کتابی دنیا، دہلی

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

URDU AFSANA

by

Prof. Ibne Kanwal

Year of Ist Edition 2011
Price Rs. (Deluxe Edition) 200/-
ISBN: 978-93-80919-24-9

نام کتاب : اردو افسانہ
مصنف، مرتب و ناشر : پروفیسر ابن کنول
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۔۷
قیمت (ڈیلکس) : ۲۰۰
سنہ اشاعت : ۲۰۱۱
کمپوزنگ : ایس۔آر۔کمپیوٹرس۔M: 9810842424493
تعداد : ۵۰۰
طبع : ایس، ایچ، آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Sandesh Prakashan
Distributor
Kitabi Duniya
1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006
Mob: 9313972589, Ph: 011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com
E-mail:kitabiduniya@gmail.com

ترتیب

۱	اردو افسانہ کا ارتقا	۵
۲	پریم چند	۱۳
۳	علی عباس حسینی	۱۸
۴	کرشن چندر	۲۲
۵	سعادت حسن منٹو	۲۸
۶	عصمت چغتائی	۳۱
۷	راجندر سنگھ بیدی	۳۶
۸	حیات اللہ انصاری	۴۰
۹	خواجہ احمد عباس	۴۴
۱۰	قرۃ العین حیدر	۴۷
۱۱	قاضی عبدالستار	۵۲

منتخب افسانے

۱	کفن	پریم چند	۶۰
۲	میلہ گھومنی	علی عباس حسینی	۶۹
۳	مہالکشمی کا پُل	کرشن چندر	۷۵
۴	ٹوبہ ٹیک سنگھ	سعادت حسن منٹو	۹۰

۵	چوتھی کا جوڑا	عصمت چغتائی	۹۸
۶	اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	۱۱۳
۷	آخری کوشش	حیات اللہ انصاری	۱۴۱
۸	ابابیل	خواجہ احمد عباس	۱۶۷
۹	نظارہ درمیاں ہے	قرۃ العین حیدر	۱۷۱
۱۰	پیتل کا گھنٹہ	قاضی عبدالستار	۱۸۶

اُردو افسانہ کا ارتقا

اردو میں افسانوی ادب کا آغاز سترہویں صدی عیسوی میں ہوا جب دکن میں ملا وجہی نے ''سب رس'' لکھی، اٹھارہویں صدی میں شمالی ہند میں ''قصہ مہر افروز و دلبر''، ''نوطرز مرصّع''، ''عجائب القصص'' اور پھر فورٹ ولیم کالج میں ''باغ و بہار''، ''آرائش محفل'' وغیرہ کی شکل میں یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ انیسویں صدی تک افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف داستان کا رواج رہا لیکن اسی صدی کے وسط میں ناول کی ابتدا ہوئی، ناول جو مغرب کے اثر سے اردو میں آیا، مغرب ہی کے زیر اثر بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں مختصر افسانہ کی ابتدا ہوئی۔ افسانہ اب اکیسویں صدی میں داخل ہو کر اپنی عمر کے سو سال پورے کر چکا ہے۔ افسانہ اپنے اس سو سالہ سفر میں کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ موضوع، ہئیت یا تکنیک کے اعتبار سے اس مدّت کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اوّل پریم چند کا عہد جو ترقی پسند تحریک کی ابتداء تک رہا، دوسرا ترقی پسند مصنفین کا عہد جس میں افسانے نے عالمی معیار حاصل کیا، تیسرا ہندستان کی آزادی کے بعد، جس میں بعض افسانہ نگاروں نے جدیدیت کے نام پر افسانے میں نئے تجربے کیے۔ علامت، تجرید اور ابہام افسانے کے کہانی پن پر حاوی رہا۔ چوتھے دور میں ستر کے بعد لکھنے والے وہ افسانہ نگار شامل ہیں جنہوں نے گزشتہ ستر سالہ تجربات سے استفادہ کر کے افسانے کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔

اردو کے اوّلین افسانہ نگاروں میں راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کے نام شامل ہیں۔ دراصل اُس زمانے میں اردو کے جو رسائل شائع ہوتے تھے ان میں اس وقت کے ادیبوں نے کچھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ کر شائع کرائیں جو اردو افسانے کی ابتدا بنیں۔ افسانے

کے بعض محققین نے راشد الخیری کے ''نصیر اور خدیجہ'' کو اردو کا پہلا افسانہ تسلیم کیا جو ''مخزن'' لاہور سے ۱۹۰۳ء میں شایع ہوا، بعض نے سرسید کے مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' کو افسانہ کا پیش رو مانا اور کچھ ناقدین نے سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا افسانہ نگار کہا، لیکن اگر منصفانہ نظر سے دیکھا جائے تو پریم چند ہی اردو کے پہلے افسانہ نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس لیے کہ سرسید نے افسانہ نہیں مضمون لکھا تھا، سجاد یلدرم نے دوسری زبان کے افسانوں کے تراجم کیے۔ البتہ راشد الخیری کی کہانی کو افسانہ کی تاریخ کا حصہ کہا جا سکتا ہے لیکن با قاعدہ افسانے کی ابتدا پریم چند کے افسانوی مجموعے ''سوز وطن'' ہی سے ہوتی ہے۔ جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ جسے انگریزی سرکار نے ضبط بھی کر لیا تھا۔

پریم چند نے عام روش سے ہٹ کر افسانے لکھے، اردو میں پہلی بار انہوں نے دیہات کی زندگی کے مسائل کو پیش کیا، یعنی انھوں نے اصل ہندستان کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا۔ دیہات میں کسانوں پر زمینداروں کے ہونے والے مظالم، توہم پرستی، چھوت چھات، ذات پات جیسے مسئلوں کو افسانوں میں پیش کر کے ملک میں غریبوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ انھوں نے قومی اور سیاسی تحریکوں میں قلمی شرکت کر کے ملک کو برطانوی سرکار اور سرمایہ داری سے آزاد کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ پریم چند کے افسانوں کے موضوعات اُن کے اردگرد کی زندگی اور اُن کے کردار اُن کے قرب وجوار میں رہنے والے افراد تھے۔ پریم چند کا دیہات کی زندگی کا مشاہدہ بہت گہرا تھا، وہ دیہات میں رہنے والوں کی زندگی کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں دیہات کی زندگی کے مرقعوں میں حقیقی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ دیہات کی زندگی کے مصوّر تھے وہ جزئیات کے بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کا بیان ذاتی تجربات ومشاہدات پر مبنی تھا۔ وہ دیہات کے لوگوں کی نفسیات کے نباض تھے، اپنے افسانوں میں انھوں نے مردوں، عورتوں اور بچوں کی نفسیاتی الجھنوں کو بڑی مہارت کے ساتھ افسانوی ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ پریم چند نے اردو افسانہ کی ایسی بنیاد رکھی کہ بعد کے لکھنے والوں نے اس پر ایسی عمارت تعمیر کی کہ اردو افسانہ بہت جلد عالمی افسانے کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا۔ افسانہ ادب کی وہ صنف ہے جس نے اردو میں رواج پانے کے بعد بہت جلد مقبولیت

حاصل کر لی اور اظہار کا اہم ترین ذریعہ بن گیا۔ پریم چند کی روایت کو اُن کے جن معاصرین نے آگے بڑھایا ان میں سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر ایسے نام ہیں جنہوں نے افسانہ کو پریم چند کی طرح معاشرہ کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ ان کے بیشتر افسانوں کا موضوع بھی دیہات کی زندگی تھا۔ سدرشن پریم چند کی حقیقت پسندی اور وطن دوستی سے بہت متاثر تھے، انھوں نے ہندستان کی دیہی اور شہری زندگی پر افسانے لکھے۔ سدرشن کو قصہ کہنے کا فن آتا تھا وہ انتہائی سادہ زبان میں عام موضوع کو بہت مؤثر انداز میں بیان کر جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کسان کی مظلومیت اور مزدور کی مجبوری کی بخوبی عکاسی کی ہے۔ سدرشن نے پہلا افسانہ ''پھول'' کے نام سے لکھا جو ۱۹۱۶ء میں ''مخزن'' میں شایع ہوا۔ ''سدا بہار پھول''، ''بہارستان''، ''چشم و چراغ''، ''طائر خیال''، ''سولہ سنگار''، ''آزمائش''، ''صبح وطن''، اور ''قوس قزح'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ سدرشن اپنے افسانوں میں موضوعاتی اعتبار سے پریم چند سے بہت قریب نظر آتے ہیں انھوں نے متوسط اور پسماندہ طبقے کے مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

پریم چند کے اصلاحی مشن کو افسانوں کے ذریعہ آگے بڑھانے میں ان کے ہم عصر علی عباس حسینی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ علی عباس حسینی نے ''پژمردہ کلیاں'' کے نام سے ۱۹۱۸ء میں اپنا پہلا افسانہ لکھا۔ ''رفیق تنہائی''، ''باسی پھول''، ''میلہ گھومنی''، ''آئی سی ایس''، ''ایک حمام میں''، ''ہمارا گاؤں''، ''کچھ نہیں ہے''، ''سیلاب کی راتیں''، ''ندیا کنارے'' اُن کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کے افسانوں میں غلام ہندستان میں طبقاتی کشمکش، ذات پات کا فرق، بیوہ کی مجبوریاں جیسے مسائل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سماج کی ایسی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے، جو معاشرے کو دیمک کی طرح کھا رہی تھیں۔ ان کی زبان پریم چند سے کچھ مختلف ہے لیکن حقیقت نگاری میں وہ پریم چند کے ہم پلہ نظر آتے ہیں بلکہ علی عباس حسینی دیہات کی زندگی کے ساتھ ساتھ قصباتی زندگی کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی دیہی اور قصباتی زندگی کے مسائل پر گہری نظر ہے، وہ معاشرے کی برائیوں کی تصویر کشی کر کے معاشرے کو صاف و شفاف دیکھنا چاہتے تھے۔ علی عباس حسینی کا اسلوب پیچیدہ یا گنجلک نہیں، وہ تشبیہات و استعارات کا استعمال تو کرتے ہیں لیکن اُن کی بات بآسانی قاری تک پہنچ جاتی ہے۔

اعظم کریوی کا نام بھی ایسے ہی افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے ہندستان کے عام آدمی کے مسائل کو افسانوں میں پیش کر کے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۲۳ء کے ''زمانہ'' میں ''انصاف یا ظلم'' کے نام سے شایع ہوا۔ اس عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعظم کریوی نے ابتدا ہی سے ظلم کے خلاف اور انصاف کے لیے قلم کی جنگ چھیڑ دی تھی۔ زمیندار اور حکام کا عوام کے ساتھ کیا رشتہ تھا، عام آدمی کس طرح مجبور اور بے بس تھا۔ اعظم کریوی نے اس مجبوری اور بے بسی کو افسانے کی شکل میں لفظی پیکر عطا کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں عام آدمی سے محبت اور ہمدردی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے اطراف میں رونما ہونے والے واقعات کو افسانوی شکل دے کر سماج کی کمزوریوں کو ظاہر کیا ہے۔ ان کی جزئیات پر گہری نظر تھی، ان کے کرداروں کا انداز تکلّم، عادات واطوار ان کی باریک بینی کو ظاہر کرتے ہیں۔ انھیں دیہات کے فطری مناظر کے بیان اور کرداروں کی زبان کے اظہار پر قدرت حاصل تھی، فطرت کے مناظر دیہات کی تصویر پیش کر دیتے ہیں اور کرداروں کی زبان کردار کو ہو بہو سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اعظم کریوی کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں ''شیخ و برہمن''، ''روپ سنگار''، ''پریم کی چوڑیاں''، ''دُکھ سکھ'' ''کنول''، ''انقلاب''، ''ہندستانی افسانے'' شامل ہیں۔

افسانے کے ابتدائی دور میں پریم چند اور ان کے ہمنواؤں کی حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کے متوازی ایک اور رجحان بھی اردو افسانے میں نمایاں تھا اور وہ تھا، رومانیت اور تخیل پرستی کا۔ اس رجحان کے زیر اثر لکھنے والے افسانہ نگار رومان اور تخیل کو ترجیح دیتے تھے، ان کے موضوعات اور اسلوب پر داستان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ یہ رجحان نیا نہیں تھا بلکہ محمد حسین آزاد، میر ناصر علی دہلوی، عبدالحلیم شرر اور بعد میں ''مخزن'' کے ذریعہ شروع کی گئی رومانی تحریک کا نام تھا۔ رومانی تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے اردو زبان کو ایک لطیف و نفیس انداز دیا۔ ان ادیبوں کے یہاں رومان کا سحر اور خیال کا طلسم تھا۔ ان کی دنیا رنگینیوں سے قریب اور تلخیوں سے پرے تھی۔ انھوں نے ادب کو زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ دلبستگی اور ذہنی آسودگی کے لیے ادب تخلیق کیا۔ رومانی اور تخیلی افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری، ل احمد اکبر آبادی، کلیم احمد شجاع،

خان احمد حسین خاں، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ افسانہ نگاروں نے افسانے میں ایک ایسی حسین ولطیف فضا پیدا کردی جو دنیا کی تلخیوں سے پرے حسن و جمال کی کیفیت کو ابھار دیتی ہے۔ان افسانہ نگاروں کا موضوع اور اسلوب حقیقت نگار اور اصلاح پسند افسانہ سے مختلف تھا۔ یہ افسانہ نگار زندگی کی کربناک نہیں بلکہ حسین اور حسین تر تصویریں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ یہ اپنے تخیل کے ذریعہ خیالستان، نگارستان اور پرستان کو تخلیق کرتے تھے۔

اردو افسانے کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۳۲ء میں کچھ نوجوان تخلیق کاروں کی تخلیقات پر مشتمل مجموعہ ''انگارے'' سامنے آیا۔ ''انگارے'' میں کل دس افسانے شامل تھے جن میں دو رشید جہاں کے، دو احمد علی کے، پانچ سجاد ظہیر اور ایک محمود الظفر کا افسانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ شروع ہونے سے قبل لکھے گئے ان افسانوں میں ترقی پسند فکر رکھنے والے نوجوانوں کا غم وغصہ تھا، کھوکھلے نظام اور بوسیدہ معاشرے پر بے باکانہ طنز اور حملہ تھا، جسے سماج اور حکومت نے برداشت نہیں کیا۔ مجموعہ ضبط کرلیا گیا۔ لیکن ترقی پسندانہ فکر رکھنے والے انہی نوجوانوں کے ذریعے ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور اس انجمن نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی جس نے ادب کا رُخ ہی بدل ڈالا۔ ترقی پسند تحریک سے اردو افسانے کو بہت فائدہ ہوا۔ حسن کا معیار بدل گیا، حسن مزدوروں اور کسانوں میں نظر آنے لگا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے دبے کچلے انسانوں کی زندگی کو افسانوں کا موضوع بنایا، سرمایہ داروں کے خلاف آواز اٹھائی۔ افسانہ کو زمین سے جوڑ دیا، زندگی کے کریہہ مناظر کو افسانوں میں پیش کیا۔ ان افسانہ نگاروں نے پریم چند اور ان کے معاصر افسانہ نگاروں کی طرح دیہی اور شہری زندگی کی بدترین تصویروں کو پیش کر کے ادب کو زندگی سے قریب کردیا۔ ان ادیبوں نے ادب برائے زندگی کا نعرہ دیا، سماجی حقیقت نگاری کے دائرہ عمل کو وسعت دی۔

ترقی پسندی تک آتے آتے اردو افسانہ اپنی عمر کی تین دہائیاں پوری کرچکا تھا، پریم چند کا افسانہ ''کفن'' لکھا جاچکا تھا۔ گزشتہ تین دہائیوں میں اردو افسانے کو ادب میں افسانوی صنف کے طور پر ایک خاص مرتبہ اور وقار حاصل ہوگیا تھا، ادیبوں کی ایک بڑی تعداد افسانے لکھ رہی تھی، افسانہ احساسات وجذبات کے اظہار کا ایک اہم ترین ذریعہ بن گیا تھا، پریم چند اور ان

کے معاصرین کے بعد جن ادیبوں نے اردو افسانے کی تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا ان میں اپندر ناتھ اشک، حیات اللہ انصاری، احمد علی، سہیل عظیم آبادی، اختر حسین رائے پوری، اختر اورینوی، سجاد ظہیر، وغیرہ شامل ہیں۔ بیسویں کی چوتھی دہائی اور پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، عزیز احمد، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، بلونت سنگھ، اختر انصاری، سعادت حسن منٹو، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز مفتی، سید انور، ابراہیم جلیس، غلام عباس، ہنس راج رہبر وغیرہ نمایاں نام ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے ہندستان کے تقریباً سبھی زبانوں کے ادب پر اثر ڈالا۔ اردو اس وقت ہندستان کی مقبول ترین زبان تھی، انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں اردو ادیبوں نے اہم کردار بھی ادا کیا تھا، اس لیے اس تحریک کے سب سے زیادہ اثرات اردو زبان ہی نے قبول کیے۔ اُس عہد کے بیشتر ادیب اور شاعر ترقی پسند تحریک سے جڑ گئے، ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے سبب اردو افسانے کو بہت عروج حاصل ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ترقی پسند ادیبوں کو اپنی بات کہنے کے لیے ایسی اصناف کی ضرورت تھی جو اُن کے پیغام کو بآسانی ادا کر سکے اور عوام تک پہنچا سکے۔ افسانہ اور نظم اس کام کے لیے بہتر اصناف تھیں۔ دونوں ہی کو اس تحریک کے زیر اثر بہت فروغ ملا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے عصری مسائل کو افسانوں کا موضوع بنا کر پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی وغیرہ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ کرشن چندر ہوں یا عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی ہوں یا حیات اللہ انصاری یا ان کے دوسرے معاصر ترقی پسند افسانہ نگار، ان سب نے اپنے افسانوں میں سماجی حقائق کے بیان ہی کو فوقیت دی۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند نے اردو افسانہ کو ایک نیا موضوع دیا اور وہ تھا تقسیم کے ردعمل میں ہونے والے فسادات۔ اس عہد کے تقریباً سبھی ترقی پسند اور غیر ترقی پسند افسانہ نگاروں نے فسادات اور ہجرت پر افسانے لکھے۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا دردناک حادثہ تھا کہ ہر تخلیق کار نے اُسے محسوس کیا اور بے باکانہ اس کا اظہار کیا۔

آزادی کے بعد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اردو افسانہ یا افسانہ نگاروں کا بھی بٹوارہ ہو گیا، ہندستان اور پاکستان کے افسانہ نگاروں کے مسائل مختلف ہو گئے،

دونوں کے موضوعات اور اسلوب میں تبدیلی آ گئی۔ پرانے لکھنے والے اُسی طرح لکھتے رہے، نئے افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل اُبھر کر سامنے آئی، ان میں بعض نے اپنی نئی راہ اختیار کی اور بعض نے ترقی پسند نظریات کو نئے انداز سے آگے بڑھایا۔ ان افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جوگندر پال، قاضی عبدالستار، حسن عسکری، رتن سنگھ، رام لعل، عابد سہیل، انور عظیم، کلام حیدری، اقبال مجید، اقبال متین، جیلانی بانو، غیاث احمد گدی، احمد یوسف، ستیش بترا وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے سماجی حقیقت نگاری کو پیش کیا، سب کے موضوعات اور اسلوب نگارش مختلف ہیں۔ اسی عہد میں یعنی بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں بعض افسانہ نگاروں نے نئے تجربات بھی کیے۔ مثلاً انور سجاد، سریندر پرکاش، رشید امجد، احمد ہمیش اور بلراج مینرا نے علامتی اور تجریدی افسانے لکھ کر افسانے کی ترسیل کو مشکل بنایا۔ اس انداز کو اور بہت سے افسانہ نگاروں نے بھی تجربے کے طور پر اختیار کیا۔ ان میں کمار پاشی، ظفر اوگانوی، شوکت حیات، حمید سہروردی اور قمر احسن کے نام بھی شامل ہیں۔ جدیدیت کے نام سے اسے ترقی پسندی کی ضد بھی کہا گیا، یوں بھی ترقی پسندوں کی وہ نظریاتی شدت کمزور پڑ گئی تھی جو آزادی سے قبل تھی۔ جدیدیت کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں سے کہانی غائب ہوگئی، علامت، تجرید، اشاریت حاوی ہوگئی۔ لیکن یہ رجحان زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہ سکا، اردو افسانہ پھر کہانی پن کی طرف لوٹ آیا۔

۱۹۷۰ء کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک ایسی نسل اُبھر کر سامنے آئی جس نے گزشتہ سات دہائیوں کے تجربات سے استفادہ کر کے افسانہ کو ایک نئی سمت عطا کی، افسانہ میں کہانی پن بھی باقی رہا اور علامت بھی مبہم نہیں ہوئی۔ ان افسانہ نگاروں میں سلام بن رزّاق، عبدالصمد، انور خاں، حسین الحق، مرزا حامد بیگ، سائرہ ہاشمی، زاہدہ حنا، اختر جمال، انور قمر، امراؤ طارق، شفق، آصف فرخی، علی امام نقوی، سید محمد اشرف، احمد داؤد، غضنفر، پیغام آفاقی، ابن کنول، طارق چھتاری، انجم عثمانی، مشرف عالم ذوقی، شموئل احمد، معین الدین جینا بڑے، عرش صدیقی، آغا سہیل، رخسانہ صولت وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ہندستان اور پاکستان میں اور بھی بہت سے ادیب افسانے لکھ رہے ہیں۔ موجودہ عہد میں نئے افسانہ نگاروں کی زبان و بیان میں الجھاؤ نہیں

ہے۔ وہ بے جا فضا سازی، مبہم علامتوں، اور غیر ضروری جزئیات سے دامن بچا کر افسانے لکھتے ہیں۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں موضوع اور مقصد حاوی رہتا تھا جس کی وجہ سے بعض اوقات افسانہ کا فن متاثر ہوتا تھا، اس کے برعکس جدید رجحان کے زیر اثر لکھے گئے افسانوں میں نہ موضوع تھا نہ مقصد۔ نامانوس علامتوں، تجرید اور ابہام پسندی کے سبب افسانہ محض ایک تحریری کھیل بن کر رہ گیا تھا۔ آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں نے اپنے لیے ایک نئی راہ متعین کی جو دونوں رجحانات کے درمیان سے گزرتی تھی۔ انھوں نے عصری مسائل کو اس طرح افسانہ کا حصہ بنایا کہ وہ نہ پروپیگنڈہ معلوم ہوا اور قاری کے لیے چیستاں بنا۔

اردو افسانہ اب اکیسویں صدی میں داخل ہو کر اپنی عمر کے سو سال پورے کر چکا ہے۔ آج بھی اردو افسانے کا یہ سفر ختم نہیں ہوا ہے بلکہ نئے لکھنے والے اپنے لیے نئے راستے بنا رہے ہیں، بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ غزل کی طرح مقبول و معروف صنف ادب ہے۔

☆☆☆

پریم چند

پریم چند اردو افسانہ نگاری میں ایک ایسا عظیم المرتبت نام ہے جو اردو افسانوی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔ پریم چند سے اردو افسانہ نگاری کا آغاز ہوا اور پریم چند نے اردو ناول کو نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔ پریم چند کا ادبی سفر ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۳۶ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس چھتیس سال کے عرصہ میں پریم چند نے اردو افسانوی ادب کو اس قدر بیش قیمت ادبی سرمایہ دیا کہ اُسے نظر انداز کر کے کوئی بھی ادبی مورخ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پریم چند نے پہلی بار اردو ادب کو گاؤں دکھایا۔ پریم چند چونکہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں اُن کی پرورش ہوئی۔ گاؤں کی تہذیب اُن کے لاشعور کا حصہ بن گئی تھی اسی لیے جب انھوں نے قلم اُٹھایا تو اُن کے لاشعور میں بسی تصویریں کاغذ پر اُبھر آئیں۔ کسان اور اُس سے وابستہ مسائل اُن کی تخلیقات کے موضوع بن گئے۔

پریم چند کا تعلق کائستھ گھرانے سے تھا، کائستھ گھرانوں میں فارسی اور اردو کی تعلیم کا رواج تھا، پریم چند بنارس کے پاس ایک گاؤں لمہی میں ۳۱/جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا، معاشی اعتبار سے گھر کی صورتحال زیادہ بہتر نہیں تھی۔ رواج کے مطابق پریم چند نے ایک مولوی صاحب سے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پریم چند آٹھ برس ہی کے تھے کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

والد نے دوسری شادی کر لی۔ سترہ برس کی عمر تھی کہ والد بھی چل بسے۔ والد نے اپنی زندگی میں پریم چند کی شادی بھی کر دی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داری کا بوجھ

پریم چند کے کاندھوں پر آ گیا۔ پریم چند بہرائچ کے ایک پرائمری اسکول میں اسسٹنٹ ماسٹر ہو گئے۔ پہلی بیوی سے پریم چند کا رشتہ کامیاب نہیں رہا انہوں نے ۱۹۰۵ء میں ایک بیوہ شیورانی دیوی سے دوسری شادی کر لی۔ پریم چند کو تعلیم کا شوق تھا ملازمت کے دوران انہوں نے پرائیویٹ طور پر انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے۔ بھی مکمل کیا۔ مختلف جگہوں پر ملازمت کی۔ بمبئی بھی گئے ایک فلم میں بھی کام کیا۔ بالآخر ۸/۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے۔

پریم چند کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ۱۹۰۲ء سے ہوئی جب انہوں نے بنارس کے ایک ہفتہ وار ''خلق'' میں ''اسرار معابد'' کے نام سے قسط وار ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ''ہم خرما وہم ثواب'' اور ''کشن'' دو ناول لکھے۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آیا جس میں ان کی تحریر کردہ پہلی کہانی ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' شامل تھی۔ یہ پانچ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں میں وطن پرستی اور آزادی کے جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔ دنیا کا انمول رتن اُس قطرۂ خون کو کہا گیا ہے جو وطن کی حفاظت کرتے ہوئے گرے۔ اس مجموعہ کی دوسری کہانیاں بھی حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہیں۔ برطانوی حکومت نے اس کتاب کی فروخت پر پابندی لگا دی۔ پریم چند نے ۱۹۳۶ء تک متعدد ناول اور افسانے تحریر کیے۔ اُن کے ناولوں میں گئودان، میدان عمل، چوگان ہستی، گوشۂ عافیت، غبن، بازار حُسن بیوہ، جلوۂ ایثار وغیرہ شامل ہیں۔ سوز وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، واردات، خواب وخیال، زادراہ، پریم چالیسی، آخری تحفہ وغیرہ اُن کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا بنیادی موضوع غریب کسان اور مزدور ہے۔ پریم چند کے لاشعور میں بسا گاؤں اور وہاں کے رہنے والوں کے مسائل ان کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں ہندستان دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہندستان جو دبی کچلی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ہندستان جو برطانوی حکومت کے ظلم کا شکار تو تھا ہی۔ اپنے ہی ملک کے زمینداروں، مہاجنوں، مذہبی رہنماؤں کے چنگل میں بھی پھنسا ہوا تھا۔ پریم چند نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سب کے روبرو کر دیا ہے۔ وہ مظلوموں اور اچھوتوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کی تکلیفوں کو افسانوں میں بیان کر کے دور کرنے کی

کوشش کرتے تھے۔ پریم چند کی تصانیف ان کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سنا اُس کو اپنے کرداروں کے ذریعہ اپنی تصانیف میں پیش کر دیا۔ پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کا تمام فکری سرمایہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے سماج کے سب سے درماندہ اور مظلوم طبقے پر غیر منصفانہ طبقاتی جبر کو تسلیم نہ کرنے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کی۔''

پریم چند نے ہندستان کے عوام کے سماجی مسائل کو حل کرنے کے لیے مجاہدانہ انداز اختیار کیا۔انہوں نے ہندستانی سماج میں بیوہ پر ہونے والے مظالم پر نہ صرف قلم اٹھایا بلکہ خود بیوہ سے شادی کر کے ایک مثال قایم کی۔

پریم چند کے افسانے اُن کے وسیع مشاہدے اور گہرے نفسیاتی مطالعے کے سبب فطرتِ انسانی کے بہترین مرقعے بن گئے ہیں۔ان کے افسانوں میں ہندستان کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ وہ اپنے پہلے ہی ناول ''اسرار معابد'' میں مذہبی پیشواؤں کے سبب معاشرے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو بیان کرتے ہیں۔ متوسط طبقہ کی زندگی کی الجھنیں ''جلوۂ ایثار'' میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ''بازارِ حسن'' میں پریم چند نے ایک طوائف کی زندگی کو پیش کر کے سماج کے ایک اور تاریک پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''گوشۂ عافیت'' میں کسانوں اور دیہات میں بسنے والوں کے مسائل کو گئودان کی طرح پیش کرتا ہے۔ پریم چند کے طویل ناول ''چوگانِ ہستی'' اور ''میدانِ عمل'' میں اُن کے عہد کی سیاسی سرگرمیاں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔غرضکہ پریم چند نے اپنے تمام ناولوں میں اپنے عہد کے ہندستان کے مختلف گوشوں کو پیش کر کے مکمل ہندستان کو پیش کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ پریم چند کی حقیقت نگاری کے قریب ان کا کوئی ہم عصر ادیب نہیں پہنچ سکا۔ مشہور ترقی پسند دانشور سجاد ظہیر نے پریم چند کے فن پر اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''پریم چند ایک محنتی، محبِ وطن اور بے لاگ ادیب تھے جو اپنے فن کو بہتر بنانے اور تجربے اور علم میں اضافہ کرنے کی کوشش میں ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ پریم چند

ہی کا کام تھا جنھوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا ہیرو بنا دیا اور اُس زندگی کی سچی تصویر کھینچی جو سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ انسان دوستی کا مظہر تھی۔''

پریم چند کے افسانے کسی ایک طبقے، نسل، ذات یا تہذیب تک محدود نہیں۔ وہ پورے ہندستانی سماج کی مکمل تصویر ہیں، جس میں دیہات اور شہر بھی دکھائی دیتا ہے اور ان میں رہنے والے مختلف طبقوں کے مسائل بھی نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے موضوع اور مواد کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں خود فرماتے ہیں:

''میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ میں اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر محض واقعے کے اظہار لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ، جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی۔ میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔''

پریم چند کی کہانیوں ہی سے سماجی حقیقت نگاری کا آغاز ہوتا ہے، پریم چند نے تین سو کے قریب افسانے لکھے۔ جن میں انہوں نے سماج کے مختلف گوشوں کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے عہد میں جہالت، غیر ضروری رسم و رواج، توہم پرستی، سماجی نابرابری، ذات پات جیسی برائیاں عام تھیں۔ پریم چند نے ان کے خلاف آواز اُٹھائی، اس آواز میں اتنی قوت تھی کہ اس کی گونج ترقی پسند اور دوسرے افسانوں نگاروں کی تخلیقات میں بھی سنائی دی۔ ان کی حیثیت ایک مصلح کی معلوم ہوتی ہے۔ اصل پریم چند ''راہ نجات''، ''سوا سیر گیہوں''، ''قربانی''، ''مشعل ہدایت''، ''بوڑھی کاکی''، ''دو بیل''، ''پوس کی رات''، ''دودھ کی قیمت''، ''پنچ پرمیشور''، ''روشنی''، ''نئی بیوی''، ''بڑے گھر کی بیٹی'' اور ''کفن'' جیسے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ پریم چند سے پہلے اردو میں افسانے کی کوئی روایت نہیں تھی، اس کے باوجود وہ افسانے کے فن پر دسترس رکھتے تھے۔ آخر میں

''کفن'' جیسا لکھ کر انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ انھیں افسانہ نویسی پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔

مذکورہ اور ان جیسے افسانوں میں کہیں کوئی کردار قرض کے بوجھ سے دبا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں سرکاری اہل کاروں کی دست درازی کا شکار ہے۔ کہیں زمیندار اور پروہت کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غرض کہ پریم چند کے افسانوں میں ہر طبقے کے افراد کی مظلومیت کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہی افسانے میں سماجی حقیقت کی ابتدا ہے جسے پریم چند نے انتہا تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ بقول پروفیسر قمر رئیس:

> ''شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جو پریم چند کی کہانیوں کا موضوع نہ ہو۔ فرقہ واریت، عورت کی قید و مظلومی، ذات پات کا امتیاز، اچھوتوں کی بدحالی، گھریلو زندگی کی الجھنیں۔ اور دوسرے سماجی مسائل کو انھوں نے بار بار مختلف زاویوں سے اپنی کہانیوں میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ اُن کے افسانوں کی ہمہ گیر مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے کسی رجحان یا کسی خاص ادیب کی پیروی نہ کر کے اپنے موضوع اور مواد کی مناسبت سے کہانی کو ایک نئے فارم میں ڈھالا، جس میں ہندوستانی قصوں کی بیانیہ سادگی، فطری سہولت اور اخلاقی قدروں کا زندہ احساس گھل مل گیا ہے۔'' (تنقیدی تناظر ص:۵۴)

پریم چند سے اردو زبان میں ایک نئے اسلوب کا آغاز ہوا، پریم چند سے قبل اردو ادب کا دائرہ محض چند شہروں تک محدود تھا پریم چند نے اردو ادب کو شہروں سے نکال کر دیہات میں پہنچایا اور عوام سے اس کا رشتہ جوڑا۔ اسی لیے ان کی زبان و بیان اُن سے پہلے کے ادیبوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سیدھی سادی بیانیہ تکنیک استعمال کی ہے جو ان کی بات قاری تک بآسانی پہنچا دیتی ہے۔ بلاشبہ پریم چند ایک ادیب ہی نہیں ایک ادارہ تھے۔ ایک دبستان تھے جن سے بعد کے ادیبوں نے لکھنے کا سلیقہ سیکھا۔

☆☆☆

علی عباس حسینی

علی عباس حسینی کا شمار اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا، پریم چند کے طرز فکر اور خیالات سے متاثر ہونے والوں میں سدرشن اور اعظم کریوی کے ساتھ علی عباس حسینی کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ پریم چند کی طرح علی عباس حسینی کا تعلق بھی اُتر پردیش کے ایک گاؤں سے تھا انہوں نے گاؤں کے ماحول کو اچھی طرح دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ گاؤں کی مٹی کی خوشبو اُن کے اندر بسی ہوئی تھی۔ حسینی ۱۳ر فروری ۱۸۹۷ء کو ضلع غازی پور کے ایک گاؤں پارہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا بچپن اسی گاؤں کے کھیت کھلیانوں میں گزرا، ابتدائی تعلیم کے لیے انھیں مدرسہ سلیمانیہ، پٹنہ میں داخل کرایا گیا، جہاں انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اُن کے گھر میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا، ان کے گھر میں اردو کی داستانیں اور ناول موجود تھے۔ مدرسہ کی تعلیم کے بعد حسینی نے الٰہ آباد سے دسویں اور لکھنؤ سے بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۱ء میں ایل ٹی کی سند حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لکھنؤ ہی میں مستقل قیام کیا اور یہیں پر ۲۷ر ستمبر ۱۹۶۹ء کو انتقال ہوا۔

علی عباس حسینی کا افسانوی سفر ۱۹۱۸ء میں اس وقت شروع ہوا جب پریم چند کے افسانے چاروں طرف مقبول ہو رہے تھے اور سجاد حیدر یلدرم اور ان کے رفقاء کے افسانے مختلف رسائل کی زینت بن رہے تھے۔ اردو میں افسانہ چلنا سیکھ رہا تھا۔ یلدرم کے افسانوں میں داستانوں جیسی رومانی فضا تھی لیکن پریم چند سماجی حقیقت نگاری کی عکاسی کر رہے تھے، اسی ماحول

میں حسینی نے اپنا پہلا افسانہ ''پژمردہ کلیاں'' لکھا، اس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے۔ ان کے افسانوں کے نو افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ جن کے نام حسب ذیل ہیں:

رفیق تنہائی، باسی پھول، میلہ گھومنی، آئی سی ایس، ہمارا گاؤں ایک حمام میں، کچھ ہنسی نہیں ہے، سیلاب کی راتیں، ندیا کنارے۔

ابتدا میں عام نوجوانوں کی طرح حسینی نے بھی رومانی رنگ قبول کرتے ہوئے کچھ رومانی افسانے لکھے۔ لیکن بہت جلد وہ رومانیت کو چھوڑ کر اس سماج کی اس حقیقت کے مصور بن گئے جسے پریم چند اپنے افسانوں میں پیش کر رہے تھے، علی عباس حسینی نے دیہات اور شہر کے اس طبقہ کے مسائل کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا جو مظلوم تھا، جو دبا کچلا کہا جاتا تھا، جس کی آواز نکلنے سے پہلے دبا دی جاتی تھی۔ حسینی کا خاص موضوع دیہات کی زندگی رہی۔ جہاں کسانوں کی سادگی اور جہالت میں بے بسی پوشیدہ تھی، جہاں زمیندار کی زبردستی سرپرستی کہلاتی تھی۔

علی عباس حسینی نے اپنے عہد کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا، وہ دیہات میں بسنے والے افراد کی زندگی سے بھی واقف تھے اور شہر کے مسائل بھی ان کے سامنے تھے۔ ان کے افسانوں میں گاؤں کے مظلوم طبقے پر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج تھا۔ انھیں ہندستان اور ہندستان میں بسنے والے اس طبقے سے محبت اور ہمدردی تھی جو غربت و افلاس اور معاشی پسماندگی کا شکار تھا، ان کے یہاں زمیندار طبقے میں پھیلی ہوئی برائیوں کا بھی ذکر ملتا ہے، کسانوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ وہاں کے متوسط طبقے کے مسلمان خاندانوں کے مسائل کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ دراصل پریم چند نے جس حقیقت نگاری کی روایت شروع کی تھی علی عباس حسینی نے اسی حقیقت نگاری کو فروغ دیا انھوں نے سماج کے مختلف طبقات کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ ہر ایک کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے، ہر طبقہ کے رسم و رواج اور عقاید کا انھیں علم تھا، انھوں نے اپنے افسانوں میں پریم چند کی طرح اصلاح پسندی کو بنیاد بنایا ہے۔ ان کا مقصد معاشرہ میں پھیلی نابرابری، چھوت چھات، غیر ضروری رسومات کو ختم کر کے غریبوں کی مشکلات کو آسان کرنا تھا۔

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی علی عباس حسینی کے افسانوں پر گفتگو آتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسینی صاحب کے افسانوں کا مرکز عام طور پر دیہات ہے۔ گاؤں کے مناظر،

اس کی سادگی، حسن اور زندگی، اس کا کُھر دراپن، زمینداروں کی زبردستیاں، کسانوں کی جہالت، یہی سب باتیں ان کے افسانوں میں عام ہیں۔ وہ گاؤں کی گلیوں وہاں کی چھوٹی موٹی سیاست، سماجی اُتار چڑھاؤ سب سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں، طبقاتی جنگ، کینہ پروری کون کون سی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ یہ ''ہمارا گاؤں'' کے شیوخ اور ''گاؤں کی لاج'' کے کرداروں میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔'' (اردو افسانے کی نئی تنقید ص: ۲۱۲)

سماج میں برائی پیدا ہونے کی وجوہات ہیں مثلاً طبقاتی تقسیم، بے روزگاری، ذات پات کی تفریق، امیر غریب کا فرق، خودغرضی، جنسی بے راہ روی، رسم ورواج کے نام پر پابندیاں وغیرہ۔ علی عباس حسینی افسانوں کے ذریعہ معاشرے کی ان خرابیوں کی نشاندہی کر کے اصلاح چاہتے تھے۔ ان کے جذبے کی صداقت ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ وہ ہندستانی سماج کی ان برائیوں کو دیکھ کر کڑھتے تھے۔ یہ درد اُن کے افسانوں میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے:

''ہندستانی شرافت اور راجپوتی غیرت یہ سننا بھی گوارا نہیں کرسکتی کہ بن بیاہی اکلوتی بیٹی پر ایک شودا لونڈا عاشق ہو''

''میں اپنی لڑکی کا اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ دوں گا مگر اسے کسی بدقوم کمینے سے بیاہ نہ کرنے دوں گا'' (گونگا ہری)

پریم چند نے بیوہ کی حمایت میں جو آواز اٹھائی تھی علی عباس حسینی نے اس آواز میں اپنی آواز کو شامل کر کے اپنے افسانوں میں بیوگی کے کرب کا اظہار کیا:

''پانچ برس کے سن میں بیاہی گئی اور بارہ برس میں بیوہ ہوئی عنفوان شباب میں شوہر کے پیار و محبت کی جگہ ساس کی جوتیاں تھیں اور نندوں کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں'' (شہید معاشرت)

''مانگ کا سیندور دھوڈالا۔ رنگیں ساری اتار کر پھٹی پرانی ساری پہن لی، جس کے سوا اُس کے پاس جسم ڈھانکنے کو اور کوئی کپڑا نہ تھا لیکن اس سوگ منانے سے

ساس نندوں کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا انھوں نے اُسے ڈائن، گھر اُجاڑن اور بھن پھیری ٹھہرا دیا اور اُسے پھونس کے محل سے نکال کر بیل کی چھپر میں جگہ دی تا کہ اُس کا منحوس سایہ اُن کی پوتر دہلیز پر نہ پڑے'' (آم کا پھل)

ہندستانی سماج کی یہی برائیاں علی عباس حسینی کے افسانوں کا خاص موضوع تھیں، وہ دیہی اور قصباتی ماحول کی عکاسی پر قدرت رکھتے تھے۔ 'کھیت''، ''گاؤں کی لاج''، ''کچھ ہنسی نہیں ہے''، ''بیلوں کی جوڑی''، ''میلہ گھومنی''، سوبیگھے''، ''نئی ہمسائی''، ''آئی سی ایس''، ''انقلاب''، ''لیڈر''، ''جل پری''، ''طمانچہ'' وغیرہ افسانوں میں ان کے فن کی بلندی اور مشاہدے اور مطالعہ کی وسعت نظر آتی ہے۔

علی عباس حسینی کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی وہ انتہائی سادہ، عام فہم اور بامحاورہ زبان میں اپنی بات کہنے کا ہنر جانتے تھے، ان کے یہاں ہندی الفاظ کا بھی خوبصورت استعمال ملتا ہے، انھوں نے دیہات کے خوبصورت مناظر کی بڑے دلکش انداز میں تصویر کشی کی ہے، ان کے افسانوں کی فضا میں مقامی رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ حسینی کو پلاٹ سازی، کردار نگاری، مکالمہ نویسی اور منظر بیانی پر مہارت حاصل تھی، ان کے افسانوں کے پلاٹ سادہ اور غیر پیچیدہ ہیں۔ کردار کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں۔ مکالمے برجستہ اور برمحل ہیں، مکالموں کا لہجہ اور زبان کرداروں کی مناسبت سے ہے۔ مناظر کا بیان افسانے میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں شامل طنز و مزاح کے عناصر نے بھی انھیں معاصرین سے کچھ مختلف کر دیا ہے۔ علی عباس حسینی نے افسانوں کے علاوہ کئی ناول اور ڈرامے بھی لکھے۔ اِن کے علاوہ ناول کے تاریخ و فن پر لکھی گئی ان کی کتاب ''ناول کی تاریخ و تنقید'' افسانوی تنقید کا اہم حصہ ہے۔

☆☆☆

کرشن چندر

اردو افسانوی ادب میں کرشن چندر کا نام بہت احترام اور عزت سے لیا جاتا ہے۔ انھیں ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار بھی کہا گیا، وہ اردو افسانے کی ایک منفرد آواز بھی ہیں اور ترقی پسند تحریک کے اہم معماروں میں بھی اُن کا شمار ہوتا ہے۔ کرشن چندر کو اُن کے خوبصورت اور دلنشیں اسلوب کی وجہ سے نثر کا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ نثر میں شاعری کرنے والا یہ افسانہ نگار ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء کو بھرت پور میں پیدا ہوا۔ کرشن چندر نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں گزارے، ان کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم لاہور سے حاصل کی۔ انگریزی میں ایم۔اے۔ کرنے کے بعد ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کیا لیکن کرشن چندر کے اندر پوشیدہ ادیب نے وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کرنے دیا۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور سے دہلی آ کر ریڈیو سے وابستہ ہو گئے لیکن بہت جلد دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی کا ماحول قلمکاروں کے لیے سازگار تھا، بمبئی میں مقیم ادیبوں اور شاعروں کا قلم ذریعۂ معاش بن جاتا تھا۔ کرشن چندر بھی فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے لکھنے لگے اور آخر تک یہیں رہے۔

کرشن چندر کو اقبالؔ اور فیضؔ کی طرح زندگی ہی میں بے پناہ مقبولیت ملی، مختلف اداروں کی جانب سے انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں حکومتِ ہند نے پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا۔

۱۹۵۶ء میں انھیں سوویت نہرو ایوارڈ ملا اور ۸ر مارچ ۱۹۷۷ء کو اردو کا یہ عظیم فکشن نگار ہمیشہ کے لیے دنیا چھوڑ گیا۔

کرشن چندر بسیار نویس تھے۔ جس قدر کرشن چندر نے لکھا شاید ہی کسی دوسرے افسانہ نگار نے اتنا لکھا ہو، ان کے ۳۰ افسانوی مجموعے، ۲۰ ناول، بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں اور کئی ڈراموں کے مجموعے شائع ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں انھوں نے افسانے لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ ان کا پہلا افسانہ ''یرقان'' کے عنوان سے ۱۹۳۶ء میں ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''طلسم خیال'' کے نام سے ۱۹۳۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد کرشن چندر کے قلم کی رفتار دھیمی نہیں ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں ''نظارے'' پھر ''زندگی کے موڑ پر''، ''نغمے کی موت''، ''پرانے خدا''، ''ہم وحشی ہیں''، ''کرن داتا''، ''تین غنڈے''، ''اجنتا سے آگے''، ''یوکلپٹس کی ڈالی'' وغیرہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شائع ہوتے رہے۔

کرشن چندر نے اپنا پہلا ناول ''شکست'' ۱۹۴۲ء میں لکھا، یہ ایک عشقیہ داستان ہے جسے انھوں نے کشمیر کے پس منظر میں لکھا تھا۔ اس میں مناظر فطرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ''شکست'' کے بعد کرشن چندر نے ''جب کھیت جاگے''، ''طوفان کی کلیاں''، ''ایک گدھے کی سرگزشت''، ایک عورت ہزار دیوانے''، ''میری یادوں کے چنار''، باون پتے''، ''دادر پُل کے بچے''، ''مٹی کے صنم''، لندن کے سات رنگ''، ''چاندی کا گھاؤ''، ''زرگاؤں کی رانی''، ''آسماں روشن ہے''، ''پانچ لوفر ایک ہیروئن''، ''کاغذ کی ناؤ''، ''برف کے پھول'' جیسے ناول مختلف وقتوں میں قلمبند کیے۔ کرشن چندر نے بچوں کے لیے بھی ناول تحریر کیے۔ جن میں ''چڑیوں کی الف لیلیٰ''، ''الٹا درخت'' اور ''لال تاج'' قابلِ ذکر ہیں۔

دراصل کرشن چندر کا لکھنے کا شوق ذریعۂ معاش بن گیا تھا۔ شوق سے پیٹ کی آگ نہیں بجھتی، کرشن چندر اس بات سے کڑھتے تھے کہ شاعر یا ادیب کو ہمارے سماج میں وہ قدر نہیں ملتی جو ملنی چاہیے۔ اپنے ناول ''باون پتے'' میں ایک جگہ اس جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

> ''اگر ضرورت نہیں ہے تو کالی داس کا نام کیوں لیتے ہو؟ ٹیگور اور غالب کی نکٹیں کیوں چھاپتے ہو؟ شیکسپیئر اور پریم چند کا نام فخر سے کیوں لیتے ہو؟ ٹالسٹائی اور گورکی کے سامنے سر کیوں جھکاتے ہو؟ تم مجھے بتاؤ، یہ تمہارا سماج کیا ہے؟ یعنی

جب تک غالبؔ زندہ رہا، تم نے اُسے بھوکوں مارا، جیل میں سڑایا، لیکن جب وہ مرگیا تو تم نے اس کی تصویر اُٹھا کے ڈاک ٹکٹوں پر چھاپ دی۔ اگر تمھیں اس کی ضرورت نہیں تھی اگر اس نے کوئی مفید کام نہیں کیا تھا تو کیوں چھاپی؟ جواب دو''

کرشن چندر تمام زندگی لکھتے رہے، لکھنا اُن کی ضرورت تھی، اسی لیے اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کمزور ناول بھی لکھے، کمزور ناول لکھنا ان کی مجبوری تھی، انھیں ناول لکھ کر اپنا گھر چلانا تھا کرشن چندر کا یہ درد اکثر اُن کے ناولوں میں نظر آجاتا ہے کہ ایک ادیب جو ہر ایک کے درد اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اُس کے درد کو کوئی محسوس نہیں کرتا، اسے سماج کی ایک غیر ضروری مخلوق سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ایک اور ناول ''آئینے اکیلے ہیں'' میں کرشن چندر اپنے اس درد کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

''میں کب کہتا ہوں کہ ملک امیر ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں ایک ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، سرکاری ملازم، کارخانے دار حتیٰ کہ کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے بھی ماہانہ روٹی روزی کا انتظام ہے، بونس ہے، بھتہ ہے، پروویڈنٹ فنڈ ہے، پنشن ہے۔ ادیب کے لیے کیا ہے؟ فاقہ؟ اس پر بھی کچھ سرپھرے لوگ اس ملک میں ایسے موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ادیبوں کو اپنے ادب کا معاوضہ روپے کی شکل میں نہ وصول کرنا چاہیے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کام کرنے والے کو اس کی محنت کا صلہ ملتا ہے اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ مگر ادیب، ناں صاحب ناں، اسے تو ہوا پر جینا چاہیے۔''

کرشن چندر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ اس انجمن کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ کرشن چندر کا افسانوی سفر رومان سے حقیقت کا سفر ہے۔ ۱۹۳۸ء ہی میں اُن کی ملاقات سجاد ظہیر جیسے ترقی پسند سے ہوگئی تھی۔ ذہن بدل گیا تھا، رومانوی حقیقت نگاری کی مثال ناول ''شکست'' کے مصنف نے حقیقت نگاری کا دامن تھام لیا تھا اور ناول ''جب کھیت جاگے'' میں تلنگانہ کے دبے کچلے ہوئے انسانوں کی انقلابی جدوجہد سامنے آگئی تھی۔ یہ ناول جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز تھی، کسانوں پر ہونے والے مظالم کا بیان تھا۔

کرشن چندر کی تصانیف انسان دوستی، انسانیت اور زندگی سے پیار محبت کی ترغیب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں، کرشن چندر غریب، بھوکے ننگے لوگوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں اور افسانوں میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں۔ اُن کے یہاں اُن کے عہد کی کراہتی ہوئی زندگی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ کرشن چندر نے پریم چند کے شروع کیے ہوئے کام کو آگے بڑھایا کرشن چندر کے موضوعات میں پریم چند کے مقابلے اور زیادہ وسعت پیدا ہوگئی ہے، انہوں نے اپنے سماج اور اُس کے نشیب و فراز، اُس کے اندر کی ناانصافیوں، بھوک، بے روزگاری، حکومت کا استحصال، وزیروں کی بے ایمانیاں، سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا ہے۔ وہ ہندستان کی سیاسی آزادی کو آزادی نہیں مانتے، ان کے نزدیک آزادی کا تصور کچھ اور ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میرے ذہن میں آزادی کا مفہوم صرف سیاسی ہی نہیں، وہ معاشی بھی ہے اور اخلاقی بھی، ذہنی بھی ہے اور تمدنی بھی۔ میں اپنی تخلیقات میں سیاسی آزادی سے کہیں زیادہ انسان کی معاشی، تمدنی اور ذہنی آزادی پر زور دیتا ہوں اور آزادی کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں سمجھتا ہوں کہ گورے کی جگہ کالا حکمراں ہو یا عیسائی کی جگہ ہندو یا مسلمان حکمراں ہو، بلکہ یہ بھی کہ انسان کو دو وقت کی روٹی ملے۔ انسانی آزادی کے اس مفہوم میں روٹی کو بھی شامل کرتا ہوں۔''

کرشن چندر کے ناولوں میں ہندستانی سماج کے بیشتر موضوعات سما گئے ہیں۔ ''باون پتے''، ''ایک عورت ہزار دیوانے''، ''دادر پُل کے بچے''، ''آسماں روشن ہے''، ''پانچ لوفر ایک ہیروئن''، ''چاندی کے گھاؤ''، ''ایک وائلن سمندر کنارے'' میں بمبئی کی فلمی اور غیر فلمی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے ''شکست'' کے علاوہ ''طوفان کی کلیاں''، ''برف کے پھول''، ''درختوں کی رانی''، ''دوسری برف سے پہلے''، ''پیار ایک خوشبو'' میں کشمیر کی زندگی اور وہاں کے خوبصورت مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ کرشن چندر کے زیادہ تر ناول کشمیر اور بمبئی کے افراد کی زندگی کو پیش کرتے ہیں لیکن وہ کردار پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

کرشن چندر نے گدھا سیریز لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے اندر طنز و مزاح کے

پیرائے میں لکھنے کی بھی صلاحیت ہے۔ ۱۹۵۷ء میں کرشن چندر کا مشہور ناول ''ایک گدھے کی سرگزشت'' چھپ کر سامنے آیا، اس کے بعد ''ایک گدھا نیفا میں'' اور ''گدھے کی واپسی'' شائع ہوئے۔ ان ناولوں کے ذریعہ کرشن چندر نے طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب میں سماج کی غلاظتوں، ناہمواریوں اور افسر شاہی کو اُجاگر کیا ہے۔

کرشن چندر اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ ۱۹۳۸ء میں ترقی پسندوں کی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ رومانی مزاج تحریر میں رومانی آہنگ ہونے کے باوجود ان کے ابتدائی افسانوں میں بھی درد کی ہلکی سی کسک اور غم کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ کرشن چندر نے اپنے افسانوں سے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں رونما ہونے والے فسادات پر لکھی گئی ان کی کہانیاں اپنے عہد کے درد کو بیان کرتی ہیں۔ ''ہم وحشی ہیں'' کے بیشتر افسانوں کا موضوع فسادات ہے، ''پشاور ایکسپریس'' فسادات سے ملنے والے درد کا ایسا اظہار ہے جو پوری انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

سماجی حقیقت نگار کی حیثیت سے کرشن چندر نے اپنے افسانوں میں شہری زندگی کی جو عکاسی کی ہے اس کی مثال بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے تیس افسانوی مجموعوں کے افسانوں میں ہندوستان کے ہر طبقے کے افراد کے مسائل موجود ہیں۔ ان کی کہانیاں مہالکشمی کا پُل، کالو بھنگی، ان داتا، زندگی کے موڑ پر، بالکونی، اردو افسانوی تاریخ کی ناقابل فراموش کہانیاں ہیں۔ ''مہالکشمی کا پُل'' میں جس طرح جزئیات کو بیان کیا گیا ہے، وہ پورے معاشرے کی بے رحم حقیقت کو آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس افسانے سے کرشن چندر کی باریک بینی اور مشاہدے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کے افسانوں کا ایک ایک جملہ طنز سے بھرپور نظر آتا ہے۔ بقول پروفیسر قمر رئیس ''اردو نثر میں سماجی اور سیاسی طنز کے شاہکار اگر کہیں ملتے ہیں تو کرشن چندر کی تحریروں میں۔ اس میدان میں کوئی دوسرا ان کا حریف و مقابل نہیں۔''
(تنقیدی تناظر، ص: ۱۵۷)

کرشن چندر کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا منفرد اسلوب ہے۔ کرشن چندر کے

بیان میں داستان کی سی رنگینی اور دلکشی ہے۔ وہ الفاظ کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ اُن کی نثر کو شاعرانہ کہا جاتا ہے۔ اُن کی نثر کشمیر کی وادیوں کی طرح خوبصورت ہے۔ وہ دلکش اور رنگین تشبیہات واستعارات کا استعمال کر کے نثر میں شادابیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریریں اُن کی جمالیاتی حِس کی غماض ہیں۔ کرشن چندر کے تخیل کی دلفریبی نے اُن کے اسلوب میں ایک منفرد رچاؤ پیدا کر دیا ہے۔ اردو میں کرشن چندر جیسا صاحب طرز افسانہ نگار دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ اسی لیے تو وارث علوی نے لکھا ہے:

> ''کہنے والوں نے کرشن چندر کو اردو افسانہ کا سب سے بڑا شاعر غلط نہیں کہا، اردو نثر پر بے پناہ عبور، اردو زبان کا خلاقانہ استعمال، ایک پُر کیف سحر آفریں اسلوب کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جو کرشن چندر کے ہر قاری سے اپنا خراج وصول کرتی ہیں''

کرشن چندر نے افسانے کی ہئیت اور تکنیک میں بھی تجربے کیے، ''دو فرلانگ لمبی سڑک''، ''ان داتا''، ''ہماری گلی''، ''پودے''، ''مردہ سمندر'' وغیرہ میں انھوں نے اپنے عہد کے اعتبار سے نئے تجربے کیے۔ کرشن چندر نے اردو افسانے کو نئی جہتیں عطا کیں۔ اردو افسانے کو نئے موضوعات اور نئے طرز بیان سے روشن کرایا۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو

بعض فنکاروں کے قلم میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ کم وقت میں بھی عظیم قلمی سرمایہ چھوڑ کر بقائے دوام حاصل کر لیتے ہیں۔ اردو افسانے کی تاریخ میں سعادت حسن منٹو ایسا ہی نام ہے۔ منٹو ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوا اور ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ کے لیے دنیا چھوڑ گیا۔ اس مختصر سی عمر میں سعادت حسن منٹو اس قدر پائدار قلمی سرمایہ چھوڑ گیا کہ مر کر بھی نہیں مرا۔ وہ کیسے مر سکتا تھا اُس کے فن میں زندگی تھی اُس کے فن نے اُسے حیاتِ دوام بخش دی۔

بیسویں صدی کے وسط کے جن چار ادیبوں کے ذکر کے بغیر اردو افسانوی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی اُن میں ایک نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔ کرشن چندر، عصمت اور راجندر سنگھ بیدی اُن کے ہم عصر ہیں۔ منٹو کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ معتوب اور مطعون افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ منٹو کے اوپر فحش نگاری کا الزام لگا ہوا ہے، اس لیے کہ اس کے بیشتر افسانوں میں طوائفوں کی زندگی اور اُن کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع کی حمایت کرتے ہوئے منٹو خود کہتا ہے:

> ''اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔ اگر اُس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیے، ویشیا کو مٹایئے، اس کا ذکر خود بہ خود مٹ جائے گا۔ ویشیا کا وجود خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ جب تک اُسے کہیں دفن نہیں کریں گے اُس کے متعلق باتیں ہوتی رہیں گی۔''

اردو کا یہ بے باک افسانہ نگار سمرالہ ضلع لدھیانہ پنجاب میں پیدا ہوا۔ منٹو کے خاندان کا تعلق کشمیری پنڈتوں سے تھا لیکن اس خاندان نے پنجاب کے امرت سر شہر میں سکونت اختیار کر لی

تھی۔ تعلیم میٹرک تک امرتسر کے مسلم ہائی اسکول میں ہوئی بعد میں کچھ وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گزرا، لیکن جلد ہی تعلیم چھوڑ کر بمبئی کے ایک ہفت روزہ فلمی رسالے ''مصور'' میں ادارت کے فرائض انجام دینا شروع کر دیئے۔ کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں بطور ڈرامہ نگار کام کیا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک فلمستان، بمبئی ٹاکیز اور امپیریل جیسی فلم کمپنیوں میں کہانی کار اور مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازمت کی۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے اور وہیں یعنی لاہور میں ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کو دنیا کو خیر باد کہا۔

کم عمر ہونے کے باوجود بھی منٹو نے بہت کچھ لکھا اُن کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے۔ اُن کے تحریر کردہ خاکوں اور مضامین کے مجموعے بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوئے۔ منٹو کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''آتش پارے'' ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ جس میں آٹھ افسانے شامل تھے۔ اس کے بعد ''منٹو کے افسانے''، ''دھواں''، ''جنازے''، ''لذت سنگ''، ''سیاہ حاشیے''، ''خالی بوتلیں خالی ڈبے''، ''برقعے''، ''رتی ماشہ تولہ''، ''شکاری عورتیں''، ''نمرود کی خدائی''، ''سڑک کے کنارے''، ''سرکنڈوں کے پیچھے''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''چغد'' وغیرہ منظر عام پر آئے۔ ''گنجے فرشتے'' اور ''لاؤڈ اسپیکر'' کے نام سے اُن کے دو خاکوں کے مجموعے بھی شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

منٹو نے زندگی کے ہر پہلو کو گہری نظر سے دیکھا، معمولی معمولی مسائل اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی لی۔ منٹو نے اپنے قلم کو زمانے کے ساتھ ساتھ چلایا، پچھلی باتوں کو دہرایا نہیں۔ اُس کے یہاں تو تا مینا کی بول چال نہیں ملتی۔ وہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کی محبتوں کے افسانے بیان نہیں کرتا۔ تقسیم ملک کے وقت اُس نے اپنی اور دوسروں کی زندگی کے تلخ پہلوؤں کو دیکھا جن کو برداشت نہ کر سکا اور جب اُس کا دہکتا ہوا لاوا افسانوں کی شکل میں کاغذ پر گرا تو ننگا سماج اپنے آپ کو ننگا دیکھ کر اُبل پڑا۔ منٹو نے اپنے عہد کے سماج کے سامنے آئینہ رکھ دیا۔ منٹو نے اپنے افسانوں پر ہونے والے ردِ عمل کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اِس

عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب وتمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ میں اُسے کپڑے پہنانے کا کام نہیں کرتا اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا ہے۔''

''انگارے'' کی اشاعت کے بعد جنس پر لکھنا غیر ممنوعہ ہو گیا تھا۔ منٹو نے بھی جنسیات پر انتہائی بے باکی سے قلم اُٹھایا، دراصل منٹو نے انسانی نفسیات کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ جس کے سبب اُسے سرکاری عتاب بھی برداشت کرنا پڑا۔ ہمارے معاشرے میں بہت سی ایسی برائیاں ہیں جنہیں دیکھ کر ہم نظر انداز کر جاتے ہیں بلکہ اُن کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ منٹو نے سماج کی انہی برائیوں کو ببانگ دہل پیش کر کے سماج کی مہذب تصویر کو چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ منٹو نے طوائفوں کی زندگی پر متعدد افسانے لکھے ہیں۔ ''کالی شلوار'' ''ہتک''، ''پھچان'' اور ''خوشیا'' اس موضوع کے بہترین نمونے ہیں۔ ان افسانوں میں منٹو نے جنسی لذّت کو مزے لے کر بیان نہیں کیا بلکہ اس کے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد منٹو کے موضوعات اور تکنیک میں تبدیلی آئی۔ تقسیم اور تقسیم کے وقت فسادات کے دوران ہونے والے غیر انسانی واقعات نے فنکاروں کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ منٹو بھی اس درد سے محفوظ نہیں تھا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''کھول دو'' میں اس درد کا اظہار نمایاں نظر آتا ہے۔

منٹو کو کہانی بیان کرنے کا ہُنر آتا تھا، ان کے افسانوں میں کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی ابہام نہیں، منظر کشی، جزئیات نگاری میں اُسے مہارت حاصل تھی، واقعہ کے بیان کو کم سے کم الفاظ میں سمیٹنے پر قدرت تھی۔ اُس کے بیشتر افسانے کرداروں کے افسانے ہیں۔ وہ کردار سازی کا ہنر جانتا تھا۔ منگو کوچوان ہو یا بشن سنگھ، سوگندھی ہو یا خوشیا، مد بھائی ہو یا بابو گوپی ناتھ۔ منٹو کے یہاں ایسے بے شمار کردار ہیں جو قاری کے ذہن سے محو نہیں ہوتے۔

بلا شبہ منٹو اردو کا ایک ایسا کہانی کار تھا جس نے زندگی کی ایسی کہانیاں بیان کر دیں جنہیں ہمیشہ دہرایا جاتا رہے گا اور جس کا نام اردو افسانوی ادب کے سنہری دور کا حصہ بنا رہے گا۔

☆☆☆

عصمت چغتائی

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اردو ادب میں چند خواتین ایسی داخل ہوئیں جنہوں نے بہت جلد اپنے قلم کی قوت سے مردوں کے سماج میں نمایاں مقام حاصل کرلیا، رشید جہاں، نذر سجاد، حجاب امتیاز علی اور عصمت چغتائی۔ یوں تو یہ سبھی نام افسانوی ادب کی تاریخ کے اہم نام ہیں لیکن افسانوی ادب میں عصمت چغتائی نے اپنے منفرد موضوعات اور منفرد طرز بیان کے ساتھ ساتھ منفرد شخصیت کے سبب جو مقام حاصل کیا اُس پر مرد فنکاروں کو بھی رشک آتا ہے۔ عصمت کی بے باکی اور حقیقت پسندی نے انھیں ایک علاحدہ پہچان عطا کی۔ عصمت چغتائی اردو کی وہ واحد خاتون قلمکار ہیں جنہوں نے سماج کی برائیوں کو بڑی خود اعتمادی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا ہے۔

عصمت چغتائی کا تعلق چنگیز خاں کے خاندان سے ہے۔ اس خاندان کے ہلاکو خاں اور چغتائی خاں دو بیٹے تھے۔ ایک چنگیز خاں کی طرح تلوار کا عاشق اور دوسرا یعنی چغتائی خاں علم و ادب کا شیدائی۔ عصمت چغتائی مرزا قسیم بیگ چغتائی کی دس اولادوں میں سے ایک تھیں، اُن کا وطن آگرہ تھا لیکن عصمت چغتائی کی ولادت ۲۱/اگست ۱۹۱۵ء کو اتر پردیش کے تاریخی شہر بدایوں میں ہوئی۔ دستور کے مطابق جب مولوی صاحب گھر پر آئے تو عصمت کا باغیانہ مزاج اس روایتی تعلیم کے لیے تیار نہ ہوا۔ عصمت کا داخلہ آگرہ کے دھن کوٹ اسکول میں کرادیا گیا۔ جب عصمت کا خاندان آگرہ سے علی گڑھ آ گیا تو ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی آگے بڑھا اور انہوں نے علی گڑھ سے ایف اے کرنے کے بعد لکھنؤ سے بی اے اور بعد میں علی گڑھ سے بی ٹی کی تعلیم حاصل

کی۔ کچھ عرصہ بریلی کے گرلز اسکول اور جودھپور کے گرلز کالج میں بحیثیت ہیڈ مسٹریس اور پرنسپل کام کیا لیکن مزاج پابندیوں کا متحمل نہیں تھا۔ عصمت نے بھی دوسرے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی طرح بمبئی کا رخ کیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ عصمت چغتائی کی شادی فلمی دنیا کی اہم شخصیت شاہد لطیف سے ہوئی۔

عصمت چغتائی کی تصانیف کی بے باکی اُن کے مزاج کی بے باکی کی عکاس ہے۔ اُن کا بچپن عام ہندستانی لڑکیوں کی طرح نہیں تھا۔ بھائیوں کے ساتھ پرورش پانے کے سبب اُن کے اندر لڑکوں کا سا کھلنڈرا پن آ گیا تھا۔ خود لکھتی ہیں:

> ''میں اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ سبھی کھیل کھیلتی جو لڑکے کھیلتے ہیں، گلی ڈنڈا، پتنگ بازی، فٹ بال کھیلتے کھیلتے میں بارہ برس کی ہوگئی۔ سچ پوچھیے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم وحیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے، پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر میں دوپٹا اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔''

عصمت چغتائی رشید جہاں اور ''انگارے'' کے مصنفین سے متاثر تھیں۔ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز کہانی ''بچپن'' سے ہوا جو مئی ۱۹۳۸ء کے ''ساقی'' میں شائع ہوئی، ''ساقی'' اور دوسرے رسالوں میں کہانیاں چھپنے کا سلسلہ چلتا رہا، ۱۹۴۲ء میں بدنام زمانہ کہانی ''لحاف'' شائع ہوئی۔ جس کی اشاعت سے ادب اور سماج میں ایک کہرام مچ گیا۔ اُن کے اوپر فحش نگار کا لیبل لگ گیا۔ ''لحاف'' کی وجہ سے انھیں ادبی نقصان بھی اٹھانا پڑا، انھیں جنسیات پر لکھنے والی ادیبہ کہہ کر ایک بڑا ادبی حلقہ انھیں نظر انداز کرنے لگا۔ لیکن عصمت چغتائی کے قلم میں ٹھہراؤ نہیں آیا وہ بچپن سے ضدی تھیں اور ضد میں سماج کی گھناؤنی تصاویر کو پیش کرتی رہیں۔ ''لحاف'' پر حکومت کی طرف سے پابندی بھی لگائی گئی۔

کرشن چندر کی طرح عصمت چغتائی بسیار نویس تھیں ان کے گیارہ افسانوی مجموعے اور گیارہ ہی ناول شائع ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں عصمت نے ''فسادی'' کے نام سے ایک ڈرامہ بھی

لکھا، اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی، اسرارالحق مجاز، سعادت حسن منٹو اور پطرس بخاری پر خاکے بھی قلمبند کیے۔ ''کاغذی ہے پیرہن'' کے نام سے اُن کی خودنوشت بھی شائع ہوئی۔ ''یہاں سے وہاں'' اور ''بمبئی سے بھوپال تک'' کے عنوانات سے لکھے گئے اُن کے رپورتاژ بھی کافی مقبول ہوئے۔ عصمت کے افسانوی مجموعوں میں ''چھوئی موئی''، ''چوٹیں''، ''دو ہاتھ''، ''بدن کی خوشبو''، ''ایک بات''، ''کلیاں''، ''لحاف'' قابل ذکر ہیں۔ اُن کے ناولوں میں ''ضدی''، ''ٹیڑھی لکیر''، ''معصومہ''، ''جنگلی کبوتر''، ''سودائی''، ''عجیب آدمی'' اور ''ایک قطرۂ خون'' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ''نقلی راجکمار'' اور ''تین اناڑی'' اُن کے بچوں کے لیے لکھے گئے ناول ہیں۔

عصمت چغتائی کی بیشتر تصانیف کا موضوع متوسط طبقے کے مسلم گھرانے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں مسلم گھرانوں کے مسائل اور اُن گھروں میں موجود عورتوں اور لڑکیوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ عصمت کے افسانوں میں محبت ایک نئی شکل میں سامنے آتی ہے جسے محبت کا منفی پہلو بھی کہہ سکتے ہیں۔ عصمت اُس عورت کو پسند نہیں کرتیں جو شوہر کی خدمت کرتے کرتے زندگی گزار دیتی ہے اُن کے نسوانی کرداروں میں بغاوت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اُن کا کہنا تھا:

> ''خواہ مخواہ کی وفا اور جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں۔ مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ عشق میں محبوب کو روگ ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا، میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقویٔ دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔ یہ سب میں نے رشید آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ آپا جیسی لڑکی سولڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔''

عصمت چغتائی نے رشید جہاں کی روایت کو آگے بڑھایا لیکن وہ رشید جہاں سے بہت آگے بڑھ گئیں۔ مارکسی فلسفۂ حیات اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے سبب عصمت کی تصانیف میں سماجی حقیقت نگاری نمایاں ہو گئی ہے۔ وہ سماج کے چھوٹے بڑے ہر مسئلے کو افسانے کا حصہ بنا دیتی ہیں۔ اتر پردیش کے متوسط مسلم گھرانے میں پلی بڑھی عصمت نے عورتوں اور لڑکیوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ بمبئی جیسے صنعتی اور مصروف شہر میں پہنچنے کے بعد بھی اُن

کے لاشعور میں بسے مسائل انھیں لکھنے کے لیے مجبور کرتے رہے۔ انھوں نے بمبئی کی بے باک زندگی پر بھی افسانے لکھے لیکن ان افسانوں میں عصمت کا فن بلندی کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے جن میں متوسط طبقہ کی خواتین، بے بس بوڑھیوں، لڑکیوں اور بچیوں کے استحصال، ذہنی خلفشار، نفسیاتی اور جنسیاتی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''چوتھی کا جوڑا''، ''دو ہاتھ''، ''گیندا''، ''جڑیں''، ''ننھی کی نانی''، ''بھول بھلیاں''، ''ساس''، ''بچھو پھوپھی'' ایسی کہانیاں ہیں جن کا شمار اردو کی بڑی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ان افسانوں میں پیش کیے گئے مسائل اور اُن کے کرداروں کا درد قاری کو تڑپا دیتا ہے۔

عصمت چغتائی کے ناولوں کا موضوع بھی طبقاتی کشمکش اور سماجی ناہمواریاں ہیں۔ ''ضدی''، ''معصومہ''، ''ٹیڑھی لکیر''، ''دل کی دنیا''، ''سودائی''، ''تین اناڑی''، ''عجیب آدمی'' اور ''ایک قطرۂ خون'' عصمت کے اہم ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ''ضدی'' عصمت کا پہلا ناول ہے، یہ ایک مختصر ناول ہے اس میں رومانیت غالب ہے۔ کہانی میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ عصمت چغتائی کا شاہکار ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ہے جو انہوں نے ''ضدی'' کے بعد لکھا۔ اس ناول کا مرکزی کردار شمن ہے جس کے گرد ناول کے تمام واقعات اور کردار اُبھر کر سامنے آتے ہیں اس ناول کو سوانحی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ شمن کے کردار میں خود عصمت چغتائی کی زندگی جھلکتی ہے۔ ٹیڑھی لکیر اردو کے بڑے اور اچھے ناولوں میں سے ایک ہے۔

عصمت چغتائی کے افسانوں میں بھی اور ناولوں میں بھی نسائی کردار نمایاں اور کامیاب کردار کے طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ عصمت عورت ہونے کے سبب عورتوں کی نفسیات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

عصمت چغتائی کا اسلوب بالکل منفرد ہے۔ انھیں زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی، روزمرہ کا استعمال، محاوروں اور کہاوتوں کی شمولیت، نادر تشبیہات اور پھر مخصوص عورتوں کی زبان نے عصمت چغتائی کے اسلوب کو صرف اور صرف ان کا مخصوص اسلوب بنا دیا ہے:

> ''اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اُتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ، اور

پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی''

عصمت تشبیہیں بھی ماحول کے مطابق تراشتی ہیں:

''دُبلی پتلی ماں اُسے اپنے گھٹنوں پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو''

''لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے''

''نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی''

عصمت چغتائی کے لاشعور میں بسی متوسط طبقہ کی وہ لڑکی یا عورت ہمیشہ افسانوں اور ناولوں کی تخلیق کے وقت اُن کے ساتھ رہی۔ جو آگرہ میں تھی۔ جس نے علی گڑھ اور لکھنؤ میں وقت گزارا۔ بمبئی کے ماحول میں بھی وہ لڑکی اُن کے گرد منڈلاتی رہی۔

عصمت چغتائی کی زندگی کا سفر ۲۴/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو بمبئی میں ختم ہو گیا لیکن اُن کی بے باک شخصیت ہمیشہ اُن کی تصانیف میں زندہ رہے گی۔

☆☆☆

راجندر سنگھ بیدی

پنجاب ہندستان کا ایک ایسا صوبہ ہے جس نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں ہر زمانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہاں پیدا ہونے والے اردو شاعروں او ۔ادیبوں کو اردو زبان کی تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اسی صوبے سے تعلق رکھنے والا بیسویں صدی عیسوی کا ایک اہم فکشن نگار راجندر سنگھ بیدی ہے۔ اردو افسانوی ادب کی تاریخ راجندر سنگھ بیدی کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔

راجندر سنگھ بیدی کے والد ضلع سیال کوٹ کے ایک گاؤں دتے کے رہنے والے تھے۔ وہ محکمۂ ڈاک میں ملازمت کے سلسلے میں لاہور آ گئے۔ یہیں پہلی ستمبر ۱۹۱۵ء کو راجندر سنگھ بیدی کی ولادت ہوئی۔ اُن کے والد سکھ اور والدہ برہمن تھیں۔ بیدی کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں میٹرک اور ۱۹۳۳ء میں ڈی اے وی کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے اور پوسٹ آفس میں ملازم ہو گئے۔ گھریلو حالات بہتر نہ ہونے کے سبب راجندر سنگھ بیدی کی تعلیم انٹرمیڈیٹ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ والدہ کا انتقال ہو گیا، والد بابا ہیرا سنگھ پوسٹ آفس کی نوکری سے سبکدوش ہو گئے۔ حالات نے انھیں بھی پوسٹ آفس کی کلرکی پر مجبور کر دیا۔

بیدی کو بچپن ہی سے پڑھنے کا شوق تھا، ماں کے پاس بیٹھ کر گیتا سنا کرتے تھے۔ اُن کے والد بیمار بیوی کا دل بہلانے کے لیے کرائے پر کتابیں لا کر سنایا کرتے تھے۔ بیدی بغور سنتے اور آہستہ آہستہ اُن کے اندر شعر کہنے اور کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ بیدی کے افسانہ ''جب میں چھوٹا تھا'' میں ان کی ابتدائی زندگی کے حالات نظر آتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے نو سال تک پوسٹ آفس میں ملازمت کی۔ جب ملک تقسیم ہوا تو بیدی دہلی چلے آئے۔ بعد میں جموں ریڈیو اسٹیشن پر اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ لیکن زیادہ عرصہ تک بیدی وہاں نہیں رہے، دہلی آئے اور پھر دہلی سے بمبئی کا رُخ کیا، بمبئی میں پہلے سے ترقی پسند ادیب اور شاعر جمع ہوگئے تھے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے باقاعدہ افسانہ نگاری کی طرف توجہ دی۔

بیدی کو بحیثیت افسانہ نگار بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور اسی مقبولیت کے سبب فلم کمپنیوں نے مکالمہ نویسی کے لیے اُن کا خیر مقدم کیا۔ فلموں میں مکالمہ نویسی میں انھیں بہت کامیابی ملی۔ انھوں نے متعدد فلموں کے لیے مکالمے قلمبند کیے۔ جن میں داغ، مرزا غالب، بڑی بہن، دیوداس، مدھومتی، ابھیمان، انورادھا شامل ہیں۔ بیدی نے خود کو پوری طرح فلمی دنیا سے جوڑ لیا تھا انہوں نے گرم کوٹ، ایک چادر میلی سی، رنگولی اور دستک جیسی فلمیں بھی بنائیں۔

راجندر سنگھ بیدی کی خدمات کو سراہتے ہوئے حکومت ہند نے اُنھیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور غالب مودی ایوارڈ بھی انھیں پیش کیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں قلم کے اس سپاہی پر فالج کا حملہ ہوا اور قلم کی رفتار ٹھہر گئی۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۸۴ء کو اردو کا یہ افسانہ نگار ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

بیدی نے طالب علمی ہی کے زمانے سے لکھنا شروع کر دیا تھا یوں تو ''مہارانی کا تحفہ'' کے نام سے اُن کی پہلی کہانی ''اردو دنیا'' میں شائع ہوئی لیکن خود بیدی افسانوی مجموعے ''دانہ و دام'' میں شامل اپنے افسانہ ''بھولا'' کو اپنا پہلا افسانہ کہتے ہیں۔ اپنے افسانوی سفر کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

> ''میں اپنی سعیِ تحریر کے بارے میں کیا لکھوں؟ یہ کوشش ''دانہ و دام'' سے شروع ہوتی ہے، 'گرہن'، 'کوکھ جلی'، 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' افسانوں کے مجموعے ہیں، ایک چھوٹا سا ناول 'ایک چادر میلی سی' ہے۔ دوسرا قدرے طویل 'نمک' ہے جو میری بیماری کی وجہ سے مکمل نہیں ہوسکا ہے۔ دو ڈرامے کے مجموعے ہیں 'سات کھیل' اور 'بے جان چیزیں'۔ میں اصل میں زود گو

ادیب نہیں ہوں۔ میں قلم اٹھا کر کاغذ کو سیاہ کرنا چاہوں بھی تو قلم رُک جاتا ہے
اور کبھی کاغذ کی معصومیت آڑے آتی ہے''

بیدی نے اپنے افسانوں کے موضوعات اپنی اطراف کی زندگی سے حاصل کیے۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے متاثر ہوکر قلم اٹھا لیتے تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کی مختلف شکلوں سے قریب کردیا تھا۔ بیدی نے خود زندگی کو ایک عام آدمی کی طرح جیا تھا بچپن ہی سے وہ پریشانیوں سے دوچار ہوگئے تھے انھوں نے زندگی کے درد کو اپنی تخلیقات میں سمودیا۔ اردو کے مشہور ناقد آل احمد سرور نے اُن کے افسانوں کے متعلق لکھا ہے:

''عام زندگی، عام لوگ، عام رشتے، اُن کے افسانوں کا موضوع ہیں مگر اُن میں
وہ ایسی طاقت اور توانائی، زندگی اور تابندگی، معنویت اور انفرادیت بھر دیتے
ہیں کہ ذہن میں روشنی ہوجاتی ہے۔ بیدی نے حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی
کوشش کی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ وہ اس حقیقت کو بیان کرتے وقت سماجی
ذمہ داری کو یکسر فراموش نہیں کرتے''

یہ سچ ہے کہ بیدی اپنے افسانوں میں انتہائی فنکارانہ انداز سے زندگی کی مختلف حقیقتوں کو پیش کر کے قاری کو جذباتی کردیتے ہیں، بیدی کا مشاہدہ وسیع تھا اس لیے اُن کے افسانوں میں ہندوستان کی تہذیب کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ بیدی کے افسانوں کا ماحول زیادہ تر دیہات سے تعلق رکھتا ہے اُن کے افسانوں میں پنجاب کا دیہات اور وہاں کے مسائل نظر آتے ہیں۔ بیدی نے اپنے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کی معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ ''لاجونتی''، ''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ''کوکھ جلی''، ''گرہن''، ''پان شاپ''، ''دس منٹ بارش میں''، ''بھولا''، ''گرم کوٹ'' جیسے افسانوں نے راجندر سنگھ بیدی کو افسانوی ادب کی تاریخ کا اہم ترین افسانہ نگار بنادیا ہے۔

بیدی کے افسانوں میں پنجاب اور پنجابی کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ بیدی کو مزاج میں انسان دوستی اور دردمندی کے سبب اُن کے معاصر افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ جذباتی افسانہ نگار کہا گیا ہے۔ اپنے افسانوں میں بیدی انسانی نفسیات کے بڑے نباض نظر آتے ہیں۔

بیدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کی زبان میں بعض خامیاں ہیں۔ دراصل بیدی اپنے افسانوں میں پنجابی اور ہندی کے الفاظ بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ''دانہ و دام''، ''چھوکری کی لوٹ''، ''من کی من میں'' اور دوسری کہانیوں میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں لیکن مجموعی طور پر اُن کا اسلوب سادہ اور قابل فہم ہوتا ہے۔

بیدی نے اپنے افسانوں میں علامتی اور اساطیری طرز کو بھی اختیار کیا وہ اساطیری عناصر شامل کر کے اپنے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب اور عقائد کو پیش کرتے ہیں۔ وہ آج کے مسائل کو پیش کرنے میں ہندو دیو مالا، یونانی دیو مالا اور مسیحی روایات کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ اساطیری عناصر کی شمولیت کے بارے میں بیدی خود کہتے ہیں:

> ''میں ہندستانی تہذیب اور عقائد کو پیش کرنے کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ اُن کے دیوی دیوتا، اُن کے مندر مسجدیں، یہ سب دکھانے کی کوشش کرتا ہوں اور اُن کا جن چیزوں سے تعلق ہے انھیں Symbol بناتا ہوں۔ مثلاً دروپدی جس کا چیر ہرن کیا تھا دُشاسن نے۔ اب دُشاسن ایک Symbol ہے جابر کا اور دروپدی سمبل بنتی ہے عزت و ناموس کا جو کہ صرف عورت ہے کا حصہ نہیں. مرد کا حصہ بھی ہے اس سلسلے میں اگر میں اُن کا ذکر کروں تو معلوم ہوگا کہ کوئی ہندستانی لکھ رہا ہے... میں اپنی ذات میں نہ صرف ہندستانی ہوں بلکہ ہندستان ہوں''

بلاشبہ راجندر سنگھ بیدی نہ صرف اپنے افسانوں میں بلکہ اپنے ناول ''ایک چادر میلی سی'' میں ہندستان اور ہندستان کی زندگی کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ اپنے منفرد انداز بیان اور منفرد موضوعات کے سبب بیدی کو افسانوی ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام ہمیشہ حاصل رہے گا۔

☆☆☆

حیات اللہ انصاری

اردو افسانے کے دوسرے دور یعنی پریم چند کے بعد لکھنے والوں میں حیات اللہ انصاری کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ حیات اللہ انصاری گاندھی وادی تھے، انھوں نے جس وقت لکھنا شروع کیا، پریم چند کی افسانہ نگاری عروج پر تھی اور ترقی پسند تحریک شروع ہونے والی تھی۔ اردو افسانہ عمر کی چوتھی دہائی میں داخل ہو چکا تھا۔ آزادی کی جدوجہد شباب پر تھی۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے عہد کے اثرات قبول کیے۔ جن کی جھلک ان کی زندگی اور اُن کی تخلیقات میں صاف نظر آتی ہے۔ حیات اللہ انصاری کی ولادت لکھنؤ کے فرنگی محل میں یکم مئی ۱۹۱۱ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی میں حاصل کی اور اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ عملی سیاست اور صحافت میں داخل ہو گئے۔ کانگریس کے اخبار ''قومی آواز'' کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں انھوں نے ہفتہ واری اخبار ''سب ساتھ'' نکالا۔ راجیہ سبھا کے ممبر اور ترقی اردو بورڈ کے ڈپٹی چیرمین بھی رہے۔ حیات اللہ انصاری اپنے نظریات پر آخر تک قایم رہے۔ ۱۸ر فروری ۱۹۹۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔

حیات اللہ انصاری گاندھی جی اور کانگریس سے تو قریب تھے ہی۔ علی گڑھ کے قیام نے انھیں ترقی پسندوں سے بھی قریب کر دیا۔ انھوں نے مارکسزم کے اثرات بھی قبول کیے۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں ''بڈھا سود خور'' کے نام سے اپنا پہلا افسانہ تحریر کیا۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' ۱۹۳۹ء شایع ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں ''بھرے بازار'' اور ۱۹۴۶ء میں ''شکستہ کنگورے'' منظر عام پر آیا۔ حیات اللہ انصاری نے کئی ناول بھی لکھے، ان کا طویل ناول ''لہو کے

پھول'' پانچ جلدوں میں ۱۹۶۹ء میں، ''مدار'' ۱۹۸۰ء میں اور ''گھروندہ'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئے۔

حیات اللہ انصاری کے تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے، لیکن افسانہ ''آخری کوشش'' کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کسی دوسرے افسانے کو نہیں ملی۔ ''آخری کوشش'' حیات اللہ انصاری کی شناخت بن گیا۔ دراصل حیات اللہ انصاری سماجی حقیقت نگاری کے پاسدار تھے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات زندگی کے مختلف پہلو ہیں، وہ تاریک سے تاریک گوشے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے تک پہنچ کر اُس کے منفی پہلو اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ محرومی اور حالات کا جبر انسان کو کس سطح تک گرا سکتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ پریم چند کی حقیقت نگاری اور ترقی پسند تحریک کے نظریات سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے ہی میں ان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ صحافی ہونے کے سبب ان کی نگاہ مسائل کو اور بھی زیادہ گہرائی سے دیکھتی اور تجزیہ کرتی تھی۔ بقول سید وقار عظیم:

> ''حیات اللہ انصاری کا ہر افسانہ، چاہے وہ 'انوکھی مصیبت' کی طرح کا معمولی افسانہ ہو اور خواہ 'آخری کوشش' اور 'پرواز' کی طرح بلند، بامعنی اور لطیف، مشاہدے کی باریک بینی کا مظہر ضرور ہے ..... حیات اللہ انصاری کے کسی افسانے کا کوئی معمولی سا واقعہ بھی ایک سیدھے سادے سپاٹ واقعہ کی طرح ہمارے سامنے نہیں آتا، بلکہ اس چھوٹے سے واقعہ کے ساتھ ہر قدم پر زندگی لپٹی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے سارے پیچ وخم موجود ہوتے ہیں''

(نیا افسانہ ص: ۱۰۷)

حقیقت نگاری کی وہ روایت جو پریم چند سے ہو کر سدرشن، علی عباس حسینی اور اعظم کریوی تک پہنچی، حیات اللہ انصاری نے ترقی پسند نظریات کے زیر اثر اُسے اور آگے بڑھایا۔ ترقی پسند تحریک سے ابتدا میں ان کی گہری وابستگی تھی۔ وہ ایک سماجی کارکن تھے، سیاست اور صحافت میں بھی ان کا دخل تھا، اسی لیے ان کا سماجی شعور زیادہ بیدار اور گہرا تھا۔ وہ سماج کی برائیوں کو جلد بھانپ لیتے تھے اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ حیات اللہ انصاری صحافی ہونے کے ناتے واقعہ کی گہرائی تک تو جاتے تھے لیکن انھیں افسانے کے فن پر اس قدر قدرت

حاصل تھی کہ افسانے میں واقعہ کے بیان پر صحافیانہ رنگ نہیں آنے دیتے تھے۔ سیاست اور صحافت نے جو اُنھیں تیز نگاہی دی تھی وہ افسانہ میں جزئیات نگاری کے بیان میں معاون ہوئی۔ انھیں جزئیات کے بیان پر کامل قدرت حاصل تھی، دیہی زندگی کی عکاسی ہو یا شہری زندگی کا بیان۔ حیات اللہ انصاری کی نگاہ ہر ایک شے کا طواف کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ''آخری کوشش'' یا ''ڈھائی سیر آٹا'' میں بڑی سفاکی سے انھوں نے حقیقت کو بیان کیا ہے۔ پروفیسر صادق نے حیات اللہ انصاری کے فن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حیات اللہ انصاری کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کے بہترین مرقعے ہیں۔ ان میں سماج کے دبے کچلے طبقے کے افراد اپنے صحیح منظر، پس منظر اور حقیقی خدوخال میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ 'آخری کوشش'، 'ڈھائی سیر آٹا'، 'سہارے کی تلاش'، 'کمزور پودا'، 'بھرے بازار میں'، 'ماں بیٹا'، موزوں کا کارخانہ'، 'مبارک ہو'، اور 'نکسیر' ان کے فن کے چند نادر نمونے ہیں۔ 'ڈھائی سیر آٹا' اردو کا اوّلین مارکسسٹ افسانہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن 'آخری کوشش' میں حیات اللہ انصاری کا فن حقیقت نگاری کی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے، جہاں تک پریم چند کی رسائی بھی نہیں ہوسکی ہے۔ 'کفن' اردو کا مکمل اور شاہکار افسانہ کہلانے کے باوجود حقیقت نگاری کے معاملے میں 'آخری کوشش' سے بہت پیچھے ہے''

(ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر ص:۳۶۱)

یہ سچ ہے کہ حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''آخری کوشش'' اردو کے چند نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ افسانہ انسانی بے حسی اور انسانی نفسیات کا بہترین عکاس ہے۔ غربت، افلاس اور فاقے آدمی کو انسانیت سوز عمل کے لیے اُکساد یتے ہیں، اس کی مثال پریم چند کے ''کفن'' کی طرح ''آخری کوشش'' میں نظر آتی ہے۔ کس طرح دو سگے بھائی غریبی سے تنگ آ کر بوڑھی اور معذور ماں کو آمدنی کا ذریعہ بنانے کے لیے ایک جھابے میں ڈال کر جامع مسجد کے سامنے لے آتے ہیں اور جب بھیک ملنے لگتی ہے تو ماں کے بٹوارے کے لیے جھگڑا ہوتا ہے اور اس کھینچا تانی میں بڑھیا مرجاتی ہے۔ اور ایک بھائی کا قتل بھی ہوجاتا ہے۔ یہ کہانی سماج کی ایک

ایسی کربناک حقیقت ہے کہ جس کے بیان سے انسانیت مجروح ہوجاتی ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اس افسانے میں جزئیات اور انسانی نفسیات کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ اِس افسانہ کو افسانہ کی فنی بلندیوں تک پہنچادیتی ہے۔

حیات اللہ انصاری کے یہاں متوسط طبقے کی زندگی کے مسائل، ان کے دُکھ درد کی عکاسی بہت سادہ اور عام فہم انداز میں کی گئی ہے۔ اُن کی زبان و بیان میں کوئی اُلجھاؤ نہیں ہے۔ وہ انتہائی مؤثر انداز میں کہانی بیان کرنے کا ہُنر جانتے تھے۔ انھیں تشبیہات، استعارات اور محاورات کے استعمال کا سلیقہ آتا تھا۔ ان کے افسانے کسی خاص موضوع تک محدود نہیں ہیں۔ انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور حیات بخشی۔ اُن کے ہر افسانے کی فضا دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔ وہ موضوع کے مطابق افسانے میں فضا بندی کرتے تھے، انھوں نے دیہات کی زندگی پر بھی افسانے لکھے، شہر کے متوسط طبقے کے مسائل کو بھی بے نقاب کیا۔ ملک کے سیاسی نظام کی بدنظمی پر بھی طنز کیا، لیکن ہر موضوع کے ساتھ انصاف کیا۔ اسی میں حیات اللہ انصاری کی کامیابی پوشیدہ ہے۔

☆☆☆

خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس کا نام اردو کے اُن فکشن نگاروں میں شمار ہوتا ہے، جنہوں نے نہ صرف قلم سے سماج کو بدلنے کی کوشش کی بلکہ عملی طور پر بھی کوشاں رہے، انھوں نے اپنی پوری زندگی کمزوروں اور مزدوروں کی حمایت کرنے میں وقف کردی۔ اُن کا تعلق ادبی خانوادے سے تھا وہ مولانا الطاف حسین حالؔی کے نواسے، خواجہ غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کی پرورش ہی ادبی ماحول میں ہوئی۔ خواجہ احمد عباس ۷/جون ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پانی پت ہی کے ''حالی مسلم اسکول'' میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ چلے آئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

خواجہ احمد عباس نے قانون کی ڈگری ضرور حاصل کی لیکن طبیعت اُس طرف کبھی مائل نہیں ہوئی۔ خاندانی روایات اور علی گڑھ کے ماحول نے اُن کے اندر کے ادیب کو بیدار کیا اور اپنے شوق کی تکمیل کے لیے قلم اٹھالیا۔ آزادی سے قبل اردو کے بیشتر نوجوان ادیب اور شاعر مارکس کے نظریات اور روس کے انقلاب سے متاثر ہوکر سرمایہ داروں کے خلاف آواز اٹھانے لگے تھے بلکہ جدوجہد آزادی میں اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر شامل ہوگئے۔

۱۹۳۶ء میں ہندوستان کے کچھ نوجوانوں نے لندن سے واپس آکر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ خواجہ احمد عباس نے اسی سال اپنا پہلا افسانہ ''ابابیل'' لکھ کر افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا، اُن کا پہلا ہی افسانہ یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوکر مقبول ہوا۔ اور پھر انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، باقاعدہ ادب اور صحافت کا دامن تھام لیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے

بعد دہلی کے ایک انگریزی اخبار ''نیشنل کال'' میں کام شروع کیا اور پھر بمبئی کا رُخ کیا۔ بمبئی جو اُس وقت اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے وطن ثانی بن گیا تھا۔ خواجہ احمد عباس نے انگریزی اخبار ''بمبئی کرانیکل'' میں ملازمت کی۔

خواجہ احمد عباس سچے وطن پرست تھے۔ انگریزوں کی ملازمت انھیں پسند نہیں تھی۔ گاندھی جی اور جواہر لال کے خیالات سے متاثر تھے۔ ہندستان کے غریب کسانوں کی بدحالی نے اُن کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ سماج کی ناہمواری اور ناانصافیوں کو ختم کرنا خواجہ احمد عباس کی زندگی کا مقصد تھا۔

خواجہ احمد عباس نے ادب، صحافت اور فلم کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی قلم بند کیے۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ایک لڑکی'' تھا، اس کے بعد ''زعفران کے پھول''، ''میں کون ہوں''، ''دیا جلے ساری رات''، ''گیہوں اور گلاب''، ''کہتے ہیں جس کو عشق''، ''پیرس کی ایک شام''، ''نیلی ساڑی''، ''بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں''، ''نئی دھرتی اور نئے انسان'' منظر عام پر آئے اور عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کی۔ خواجہ احمد عباس کے تحریر کردہ ناولوں میں ''چار دل چار راہیں''، ''انقلاب''، ''دو بوند پانی''، ''بمبئی رات کی بانہوں میں'' قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ خواجہ احمد عباس نے کئی ڈرامے اور سفرنامے بھی تحریر کیے۔

خواجہ احمد عباس کی تخلیقات میں سماجی زندگی کی معاشی کشمکش افراد کی اُلجھنیں، اونچ نیچ، صارفانہ ذہنیت جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی سچائیاں پیش کی ہیں۔ وہ مختلف تہذیبی پہلوؤں اور سیاسی بدنظمیوں پر بھی طنز کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کے مسائل متوسط طبقے کے مسائل ہیں۔ اُن کا پس منظر دبے کچلے انسانوں کی زندگی ہے۔ اُن کے افسانوں میں ڈرامائی عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ انتہائی سادہ اور سلیس انداز میں بات کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر پریم چند کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح خواجہ احمد عباس بھی ہمیشہ مزدوروں اور محنت کشوں کی حمایت کرتے ہیں۔

اُن کے ناول بھی ہندستانی سماج کی مختلف کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ ''انقلاب'' میں جنگ آزادی کے ایک خاص دور کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ بمبئی کی کھوکھلی، بناوٹی، چمک دمک کی زندگی کو خواجہ احمد عباس نے اپنے ناول ''بمبئی رات کی باہوں میں'' میں دکھایا ہے۔ کس طرح بمبئی کے فٹ پاتھ اور جھونپڑیوں میں زندگی گزارنے والے دولت مند بننے کے خواب دیکھتے ہیں اور جائز و ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرتے ہیں۔ ''اندھیرا اُجالا'' میں بھی بمبئی کی فلمی دنیا کے تاریک و روشن پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنے جذبات کے اظہار اور مقصد کی تکمیل کے لیے کئی اچھی اور کامیاب فلمیں بھی بنائیں۔ ان کی بنائی ہوئی فلموں میں ''دھرتی کا لال''، ''نیا سنسار''، ''آوارہ''، ''پردیسی''، ''سات ہندستانی''، ''ہمارا گھر''، ''شہر اور سپنا'' قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ہندستانی فلموں کو نیا انداز دیا، اُن کی ترقی پسندانہ فکر اُن کی فلموں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

خواجہ احمد عباس کی ادبی اور دیگر خدمات کے لیے حکومت ہند نے انھیں ۱۹۶۸ء میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ اس کے علاوہ متعدد انعامات و اعزازات اُن کی خدمت میں پیش کیے۔ ادب و قوم کا یہ سچا خادم یکم جون ۱۹۸۷ء کو ہمیشہ کے لیے اِس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ خواجہ احمد عباس نے اردو فکشن، صحافت اور فلمی دنیا میں ایسے اہم کام انجام دیئے جن کے سبب انھیں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

☆☆☆

قرۃ العین حیدر

اردو زبان و ادب جن ادیبوں پر ہمیشہ ناز کرتا رہے گا ان میں سے ایک نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔ قرۃ العین کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کی انفرادیت اُن کا اسلوب جلیل ہے، یہی اسلوب قرۃ العین کو اُن کے معاصرین میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ قرۃ العین اردو کے معروف ادیب سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر کی بیٹی تھیں۔ اُن کی ولادت ۲۰ر جنوری ۱۹۲۸ء کو علی گڑھ میں ہوئی۔ تعلیم یافتہ اور جاگیردار خاندان کی چشم و چراغ کو ابتدائی رسمی تعلیم کے بعد دہرادون کے کانونٹ اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ بچپن ہی سے انگریزی تعلیم دلائی گئی۔ اس کے بعد لکھنؤ کے مشہور ازبیلا تھوبرن کالج سے بی اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔

تقسیمِ ملک کے بعد قرۃ العین پاکستان منتقل ہوگئیں۔ اُن کے والد سید سجاد حیدر یلدرم کا ۱۹۴۳ء ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ پاکستان کی حکومت میں وہ وزارت اطلاعات ونشریات میں انفارمیشن آفیسر رہیں۔ بعد میں لندن میں پاکستان ایمبیسی میں پریس اٹیچی کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس قرۃ العین حیدر واپس ہندستان آ گئیں اور یہاں انگریزی صحافت سے جُڑ گئیں، امپرنٹ بمبئی اور السٹریڈ ویکلی سے وابستہ رہیں۔ حکومت کی طرف سے انھیں پدم شری کے اعزاز اور گیان پیٹھ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ان کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔

۲۱ر اگست ۲۰۰۷ء کو قرۃ العین حیدر ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

قرۃ العین نے طالب علمی ہی کے زمانے سے لکھنا شروع کر دیا تھا وہ انگریزی ادب کی طالب علم تھیں، اسی لیے انگریزی ادیبوں کے اثرات بھی انہوں نے قبول کیے۔ گھر میں ادبی ماحول تھا والدین خود افسانہ نگار تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' منظر عام آیا۔ پھر اُن کے افسانوں کے دوسرے مجموعے ''شیشے کے گھر''، ''پت جھڑ کی آواز''، ''روشنی کی رفتار'' اور ''جگنوؤں کی دنیا'' شائع ہوئے۔ قرۃ العین حیدر نے کئی ناول بھی لکھے۔ ۱۹۴۷ء کی تباہی نے جوان کے دل پر اثرات چھوڑے وہ ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کی شکل میں ۱۹۴۹ء میں سامنے آئے۔ ۱۹۵۲ء میں قرۃ العین نے اپنا دوسرا ناول ''سفینۂ غم دل'' لکھا۔ ان کا مشہور ناول ''آگ کا دریا'' ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں ایک اور ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' سامنے آیا۔ سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' دو جلدوں میں شائع ہوا۔ ان کے بعد قرۃ العین کے دو اور ناول ''گردش رنگ چمن'' اور ''چاندنی بیگم'' شائع ہوئے۔ قرۃ العین نے ''دلربا''، ''سیتا ہرن''، ''چائے کے باغ''، ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' کے نام سے چار ناولٹ بھی لکھے۔ انہوں نے کئی ریپورتاژ بھی لکھے اور دوسری زبانوں میں لکھی گئی کچھ کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا۔

قرۃ العین کے موضوعات محدود ہیں۔ انہوں نے عام آدمی یا نچلے طبقے کے افراد کو اپنی تصانیف کا موضوع کم ہی بنایا ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کے کردار جاگیردارانہ نظام، اعلیٰ طبقہ کے لوگ یا کانوینٹ کی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں۔ انہوں نے اُس ماحول کو اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے جس میں اُن کی زندگی گزری یا جس کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔ اپنے موضوعات کے بارے میں خود لکھتی ہیں:

> ''میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے ماحول کے بارے میں لکھا جو کہ اس وقت ایک بڑی انوکھی چیز سمجھی گئی۔ لوگوں نے کہا نہ جانے کس دنیا کی باتیں کرتی ہے۔ حالانکہ میں اپنے ہی ماحول کی فیوڈل (Westernised upper class) کی باتیں کرتی تھی۔ حال ہی میں جب میں نے ''ستاروں سے آگے'' کے افسانے پڑھے تو مجھے خود حیرت ہوئی کہ میں کیا لکھتی تھی وہ لڑکیاں کانونٹ کالج میں پڑھ رہی ہیں، فوجی افسر ہیں، پارٹیاں ہیں، کلب میں ڈانسر ہیں وہ پورا میلیو

ہندستان کے بہت ہی محدود طبقے کا تھا جن کے یہاں کئی نسلوں سے مغربیت تھی اور Sophistication تھا۔ یہ ایک خاص طبقہ تھا برٹش انڈیا کا۔ برٹش انڈیا کا اپنا کپلنگ والا ایک ماحول تھا جس میں میں نے آنکھ کھولی تھی''

قرۃ العین حیدر کا تعلق جاگیردار گھرانے سے تھا آزادی کے بعد انہوں نے زمینداروں کی ٹوٹتی بکھرتی زندگی دیکھی تھی۔ قاضی عبدالستار کی طرح قرۃ العین نے زمیندار طبقے کی بدلتی زندگی کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' اور ''حسب نسب'' اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں نو دولتیوں کی دولت کمانے کی دوڑ اور کم ظرفی کے ساتھ ساتھ زمیندار طبقے کی گرتی ہوئی حالت اور زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کو پیش کیا گیا ہے۔ ''حسب نسب'' کی چھمی بیگم بھی حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں۔ دونوں ہی افسانے پرانی قدروں کی شکست وریخت کو بیان کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے موضوعات اپنے معاصر ترقی پسند افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف تھے۔ انھوں نے ترقی پسندوں سے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ ان پر مغربی فنکاروں کا براہ راست اثر تھا خاص طور پر ورجینیا وولف کی تصانیف سے وہ بہت متاثر تھیں۔ بعض ناقدین قرۃ العین کو جدید افسانے کا نقطۂ آغاز سمجھتے ہیں۔ اور ان کے افسانوں ''ستاروں سے آگے''، ''رقص شرر'' اور ''جہاں کارواں ٹھہرا تھا'' کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تجریدی اور علامتی انداز بھی ملتا ہے۔ مشہور ناقد وحید اختر قرۃ العین کے افسانوں پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان پر کوئی لیبل چسپاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ جدید بھی ہیں، ان میں کہانی پن بھی ہے، سماجی آگہی بھی، تاریخی بصیرت بھی۔ ان میں سے بہترین ہماری زبان کے افسانوی ادب کے شاہ کار ہیں۔ اُن کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ اس نے افسانے کی زبان کو عمیق فلسفیانہ و مابعدِ الطبیعیاتی تصورات اور پیچیدہ اخلاقی ونفسی مسائل کے تخلیقی اظہار کے قابل بنایا ہے''

قرۃ العین کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ بہت وسیع ہے اسی لیے ان کے افسانوں میں

علامت نگاری اور اسطور سازی کے وقت ہزاروں سال پرانی تاریخ اور تہذیب چلی آئی ہے۔ قرۃ العین کے تمام ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اُن کے ناول ہندستان کی صدیوں پرانی تاریخ وتہذیب کے عکاس ہیں۔قرۃ العین نے اپنے ناولوں میں شعور کی رو تکنیک کا استعمال کیا ہے۔اس اعتبار سے وہ اردو کی پہلی ناول نگار ہیں انہوں نے ناول کو جدید خوبیوں سے آراستہ کر کے ناول نگاری کی تاریخ میں ایک نیا طرز اختیار کیا ہے۔شعور کی رو تکنیک کو پوری طرح ''آگ کا دریا'' میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ناول ہندستان کی ہزاروں سال کی تاریخ وتہذیب کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔اس کے کینوس کی وسعت نے اسے قرۃ العین کے دوسرے ناولوں سے مختلف کر دیا ہے۔اس ناول میں ماضی بعید، ماضی قریب اور حال کی بدلتی تہذیبی اقدار اور ان کے ٹکراؤ کو پیش کیا گیا ہے۔ڈھائی ہزار سال پہلے کا گوتم نیلمبر ،عہد وسطیٰ کا کمال الدین اور عہد جدید کا کمال، گوتم اور چمپا سب ایک کرب میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔مختلف زمانوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے قرۃ العین نے ایک وحدت قایم کی ہے۔''آگ کا دریا'' ایک تہذیبی دستاویز بن گیا ہے۔مشہور ناقد وحید اختر اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اس ناول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے ہزاروں برس کے وسیع پس منظر کو ناول کے کینوس پر پھیلا دیا ہے۔اس طرح ہندستان کی کئی ہزار سالہ تاریخ، کلچر، فلسفے اور رسم ورواج اس دریا کی موجوں میں سمٹ آئے ہیں۔ اس لحاظ سے شاید یہ دنیا کے ادب میں اپنی طرز کی پہلی اور منفرد کوشش ہے''

قرۃ العین حیدر کو ہندستان کی تاریخ سے دلچسپی ہے۔فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعہ وہ تاریخ کو بیان کرنے لگتی ہیں، تقسیم ہند کا کرب ان کی تصانیف کا حصہ بن گیا ہے۔''میرے بھی صنم خانے''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''جلاوطن''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہم سفر'' سب میں اسی موضوع کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنے ناول اور افسانوں میں کردار کے لحاظ سے زبان تخلیق کرتی ہیں۔ان کے بیشتر کرداروں کا تعلق اعلیٰ سوسائٹی سے ہے ان میں راجے مہاراجے، نواب، زمیندار، اعلیٰ عہدوں پر فائز افسر، پروفیسر، ڈاکٹر،

انجینئر، دانشور وغیرہ شامل ہیں۔ عصمت چغتائی کی طرح قرۃ العین کے یہاں بھی نسوانی کرداروں کی بہتات ہے۔ عصمت کی عورت متوسط طبقے کی دبی کچلی، آفت زدہ عورت ہے۔ قرۃ العین کے نسوانی کردار اگر جاگیرداری نظام کے زوال کا شکار ہو گئے ہیں تو موڈرن سماج کا حصہ بن کر ابھر آئے ہیں، اعلیٰ تعلیم سے مزّین ہیں۔ وجیہہ و نفیس کرداروں کے سبب اُن کی زبان میں ایک خاص قسم کی وجاہت اور نفاست نظر آتی ہے۔ قرۃ العین کا اسلوب محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کے اسلوب کی توسیع ہے۔ ان کی تصانیف میں داستانوں کا سا اسلوب جلیل، جزئیات نگاری، منظر کشی اور تہذیبی مرقعے نظر آتے ہیں۔ اردو افسانوی ادب کی تاریخ میں قرۃ العین حیدر کا نام ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا اس لیے کہ اُن کے موضوعات مختلف ہیں اور اسلوب منفرد ہے۔

☆☆☆

قاضی عبدالستار

بیسویں صدی کے سوسالہ افسانوی ادب کے سفر میں بہت سے اہم نام اُبھر کر سامنے آئے۔ جن میں ایک نام قاضی عبدالستار کا بھی ہے۔ قاضی عبدالستار کو اپنے منفرد اسلوب اور مخصوص موضوع کی وجہ سے ایک علاحدہ شناخت ملی۔ اُن کے پہلے ہی ناول نے انھیں بڑے فنکاروں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا۔ قاضی صاحب کا تعلق اتر پردیش کے زمیندار گھرانے سے تھا انہوں نے زمینداری کے تمام نشیب و فراز اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اگر چہ زمینداری کے ختم ہونے کے بعد ایک پورا معاشرہ ختم ہو گیا اچھے اچھے زمیندار تلاشِ معاش میں زمینداری اور وضع داری کو بھول گئے لیکن قاضی عبدالستار عرف چھبّن بھیا آف مچھریٹہ اسٹیٹ اودھ نے اپنی وضع داری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا اور انداز گفتگو میں اب بھی جاگیردارانہ جھلک باقی ہے۔

قاضی عبدالستار کی ولادت ۹ رفروری ۱۹۳۳ء کو اتر پردیش کے ایک گاؤں مچھریٹہ ضلع سیتاپور میں ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں آر۔ڈی۔کالج سیتاپور سے ہائی اسکول اور ۱۹۵۰ء میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ سے بی۔اے۔ اور ۱۹۵۴ء میں ایم۔اے۔ کی سند گولڈ میڈل کے ساتھ حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ چلے آئے اور یہاں سے ۱۹۵۷ء میں پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا اور یہیں سے پروفیسر اور صدرِ شعبہ ہونے کے بعد سبکدوش ہوئے۔

قاضی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں شعر کہنا

شروع کیا۔ صہبا تخلص کرتے تھے۔ بابو گر چرن لال شیدا نبی نگری سے اصلاح لیتے تھے۔ ۱۹۵۶ء تک ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ پہلا افسانہ بعنوان ''اندھا'' ۱۹۴۸ء میں لکھا جو شارب لکھنوی نے اپنے ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ اس تعریف کے باوجود اُنہوں نے ۶۳ء تک کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ غزلیں اور قطعات کہتے رہے۔ ان کی خوبصورت تشبیہات نے انھیں کافی مشہور کیا۔ شاعری کا خمار اس قدر چڑھا کہ دوسری سب چیزوں سے منھ موڑ لیا۔ ہاکی اور فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے لیکن شاعری سے یہ نہ دیکھا گیا کہ وہ بیک وقت اچھے کھلاڑی اور شاعر بنیں۔ اس لیے کھیل سے کنارہ اختیار کیا اور مکمل شاعر بن گئے۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ شاعری سے نفرت ہوگئی اور شاعری بالکل ترک کردی۔

ہوا یہ کہ بارہ بنکی کے مشاعرہ میں گئے وہاں ایک رئیس کے مہمان خانہ میں آرام کررہے تھے کہ کچھ لڑکیاں اُدھر کو آتی ہوئی دکھائی دیں لیکن فوراً ہی پیچھے سے اُن کی ماں دوڑی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں ''اے لڑکیوں ادھر مت جانا ادھر وہ شاعر ٹھہرا ہوا ہے۔'' قاضی صاحب نے سوچا کہ شاعر ایسی چیز ہے کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو بھی اس کے سامنے جانے سے روکتے ہیں اور شاعری بالکل چھوڑ دی۔

قاضی عبدالستار نے پہلا ناول ''شکست کی آواز'' ۱۹۵۵ء میں لکھا جب وہ شائع ہوکر منظر عام پر آیا تو طباعت کی خرابی کے باوجود عوام وخواص میں بہت پسند کیا گیا۔ اس وقت قاضی صاحب کو احساس ہوا کہ وہ نثر بھی اچھی لکھ سکتے ہیں اور جب مجنوں گورکھپوری اور قرۃ العین حیدر نے اُن کی ہمت افزائی کی تو ان کا یہ احساس یقین میں تبدیل ہوگیا۔ اس کے بعد وہ پوری طرح سے نثر کی طرف راغب ہوگئے۔ ۱۹۶۰ء میں ''دود چراغ محفل'' کے نام سے ''شکست کی آواز'' دوبارہ شائع ہوا۔ اور پھر جو بھیا، شب گزیدہ، غبار شب، بادل وغیرہ یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اتنے ناول یا ناولٹ لکھنے کے بعد انھوں نے اپنا مشہور افسانہ ''پیتل کا گھنٹہ'' لکھا جو ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا اور اسی میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں لکھے گئے اس افسانے سے ہی قاضی صاحب اپنی افسانہ نگاری کا آغاز مانتے ہیں۔ اب تک انہوں نے متعدد ناول، ناولٹ اور افسانے لکھے ہیں۔ اُن کی اب تک کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) شکست کی آواز (۱۹۵۵ء): بعد میں یہ ناول ''دود چراغ محفل'' اور پہلا اور آخری خط'' کے نام سے شائع ہوا۔

(۲) مجو بھیا (۱۹۶۱ء) (۳) غبار شب (۱۹۶۳ء)

(۴) شب گزیدہ (۱۹۶۴ء) (۵) بادل (۱۹۶۵ء)

(۶) داراشکوہ (۱۹۶۷ء) (۷) صلاح الدین ایوبیؒ (۱۹۶۸ء)

(۸) غالبؔ (۱۹۸۶ء) (۹) خالد بن ولیدؓ (۱۹۹۵ء)

(۱۰) حضرت جان (۱۹۹۰ء) (۱۱) آئینہ ایام: افسانوی مجموعہ (۱۹۹۵ء)

جس وقت قاضی صاحب علی گڑھ منتقل ہوئے۔ شاعری سے اُن کا تعلق تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ نثر سے محبت بہت حد تک بڑھ چکی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے ایک آواز بلند کی کہ یہ عہد نثر کا عہد ہے۔ شاعری کا نہیں۔ اسی دوران انہوں نے علی گڑھ کے ایک ادبی جلسہ میں اپنا مقالہ ''نثر کا عہد'' پڑھا۔ جس میں انہوں نے شاعری کو پرانی چیز بتایا اور بیسویں صدی کو نثر کا عہد کہا۔

قاضی عبدالستار کی پرورش ایک خاص ماحول میں ہوئی جس کا رنگ ان کی تخلیقات پر پوری طرح غالب ہے یہ دیہات کا ماحول ہے جس میں انہوں نے آنکھ کھولی۔ بچپن گزارا اور جوان ہو کر اس مخصوص معاشرہ میں انقلاب دیکھا۔ قاضی صاحب پر اس نظام کے ٹوٹنے کا بہت اثر ہوا۔ اسی احساس کا مظہر ان کی تمام تخلیقات ہیں۔ پریم چند اور قاضی عبدالستار دونوں کا تعلق دیہات سے ہے دونوں کا موضوع دیہات ہے لیکن دونوں کے کردار مختلف ہیں۔ پریم چند کا ہندستان آزادی سے پہلے کا ہندستان ہے۔ جس میں زمیندار ظالم اور کسان مظلوم ہے۔ قاضی عبدالستار کا ہندستان آزادی کے بعد کا ہے، جب جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو گیا اور خود زمیندار کی حالت مزدوروں اور کسانوں کی طرح ہوگئی پریم چند کے یہاں کسانوں کی دشواریوں اور مجبوریوں کا ذکر ہے تو قاضی عبدالستار کے یہاں اُجڑے ہوئے زمینداروں کے قلب کی بے ترتیب دھڑکنوں کا تجزیہ ہے۔ ''شکست کی آواز'' سے لے کر ''میراث'' تک کے ناولوں اور افسانوں میں ان دھڑکنوں کی آواز سنائی دیتی ہیں۔ ''پیتل کا گھنٹہ'' میں قاضی صاحب نے جس

پُرسوز انداز میں اس انقلاب کی زد میں آیا ہوا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جس میں میرؔ کے شعر کا سا درد محسوس ہوتا ہے۔ قاضی انعام حسین جو اس افسانہ کا مرکزی کردار ہے کے بارے میں لکھا ہے:

''بھسول کے قاضی انعام حسین جن کی حکومت اور دولت کے افسانے اپنے گھر میں سُن چکا تھا''

زمینداری ختم ہونے کے بعد مصنف قاضی انعام حسین کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ جس کے اردگرد سپاہیوں اور پاسیوں کا مجمع حکم سننے کے لیے اکٹھا رہتا تھا:

''ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے۔ لمبے قد کے، جھکے ہوئے، ڈوریے کی قمیض میلا پاجامہ اور موٹر ٹائر کے تلوؤں کا پرانا جوتا پہنے ہوئے۔ ماتھے پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے سلام کیا جواب دینے کے بجائے وہ میرے قریب آئے اور کھل گئے، میرے ہاتھ سے میرا بیگ چھین لیا اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے ڈیوڑھی میں گھس گئے۔

ہم اس چکر دار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے۔ جس کی چھت کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ دھنیوں کو گھنے ہوئے شہتیر روکے ہوئے تھے۔ وہ ڈیوڑھی ہی سے چلائے ''ارے سنتی ہو۔ دیکھو! کون آیا ہے، اگر صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کر لو جلدی سے'' لیکن دادی تو سامنے ہی کھڑی تھیں، ڈھلے ہوئے گھڑوں کی گھڑونچی کے پاس دادا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ وہ شرمندہ سی کھڑی تھیں پھر انہوں نے لپک کر گھر کی الگنی پر پڑی مارکین کی ڈھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹہ کی طرح اوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند چھپ جائے''

''مالکن'' میں رونق پور کی تعلقہ دار کی بیوہ مالکن کی روداد بیان کرنے میں جو درد پیدا کیا ہے وہ قاضی عبدالستار ہی کے قلم کا کمال ہے۔ ''مالکن'' کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

''شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے مالکن کہہ رہی تھیں اپنے کرتوں کی تزیب تو آپ بھیجتے رہیے گا لیکن پہلے یہ چاروں کرتے بکوا دیجیے۔''

قاضی عبدالستار کے یہاں حزن و ملال کی فراوانی اور درد واندوہ کی ارزانی ایک خاص عنصر کے روپ میں ملتی ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ وہ خارجیت سے کم اور داخلیت سے زیادہ منسلک ہیں۔ ان کی تخلیقات پڑھتے وقت قاری اُس دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں زمانے کی ناسازیوں، ستم ظریفیوں، درد و کسک، دل کی بے تاب دھڑکنوں اور آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ''پہلا اور آخری خط'' کا شمی اور جاوید، ''شب گزیدہ'' کا جمی، مالکن، قاضی انعام حسین، رضو باجی وغیرہ انھیں بے تاب دھڑکنوں سے تراشے اور آنسوؤں سے سینچے ہوئے ایسے کردار ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کے قلب کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے، وہ سسکیاں بھرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اُن کے یہاں میرؔ کا سا کرب ہے۔

قاضی صاحب کے افسانوں میں عورت کا کردار خاصا نمایاں ہے۔ ان کے یہاں عورت کے مختلف روپ ہیں۔ ایک وہ جس میں حسن، حجاب، حیا، نرمی اور لنوازی ہے دوسری وہ جو کسی مجبوری کے تحت بے حجاب ہوتی ہے یا خوبصورتی کے سبب کر دی جاتی ہے اور ایک ایسی عورت بھی اُن کے یہاں ہے جو خود جنسی راہ پر گامزن ہے۔ ''پہلا اور آخری خط'' کی شمی، ''رضو باجی'' کی رضو باجی، ''بادل'' کی زینو، ''شب گزیدہ'' کی زبیدہ عورت کے ایسے کردار ہیں جن کے پاس حسن کے ساتھ ساتھ شرم و حیا کے قیمتی جوہر بھی ہیں۔ دوسرے قسم کی عورتوں میں ''مجو بھیا'' کی للّی، ''شب گزیدہ'' کی روپا وغیرہ نظر آتی ہیں۔ تیسرا کردار چندہ (مجو بھیا)، مہرن اور چندہ (شب گزیدہ) لیلا (دھوئے گئے کچھ ایسے...) میں ملتا ہے۔ ماحول کے مطابق اور بھی کئی کردار عورتوں کے مل جاتے ہیں لیکن سب کرداروں پر شمی، رضو باجی، زینو، زبیدہ، اوشا (غبار شب) اور مالکن حاوی ہیں۔ ان میں بے پناہ توانائی اور کشش ہے۔ یہی کردار ان کے مخصوص موضوع کی عکاسی کرتے ہیں۔

داستانوں کی ایک اہم خوبی قوتِ بیان اور شکوہِ زبان رہی ہے۔ جس کی وجہ سے سامعین کی تمام تر توجہ داستان گو کی طرف مبذول ہو جاتی تھی اور جس کی وجہ سے بے جا طوالت گراں نہیں گزرتی تھی۔ قاضی عبدالستار نے زبان و بیان کا یہ فن داستانوں سے سیکھا ہے۔ اُن کی زبان و بیان میں وہ کشش ہے جو پہلی ہی سطر سے قاری کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور قاری اُس

کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس پر ایک نشہ سا طاری ہو جاتا ہے جو ناول یا افسانہ کے اختتام پر ہی اتر پاتا ہے۔ ہر تحریر کی سب سے بڑی اور اہم خوبی یہی ہونی چاہیے کہ وہ قاری یا سامع پر ایسا اثر پیدا کرے کہ وہ پڑھنے یا سننے کے لیے مجبور ہو جائے۔ قاضی عبدالستار کی نثر میں یہ خوبی ہے۔ انھیں لکھنے اور اُس کی بلند خوانی دونوں میں قدرت حاصل ہے۔ وہ الفاظ کی تراش خراش اور در و بست میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ لفظوں کے سنگ مرمر سے تحریری تاج محل تعمیر کر دیتے ہیں۔ جس میں تشبیہات اور استعارات کے جواہر جڑے ہوتے ہیں۔ انھیں استعارات کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کو ماحول کے مطابق تشبیہات اور استعارات ڈھالنے کا فن آتا ہے۔ اُن کے تاریخی ناولوں میں موجود تشبیہات اور استعارات اودھ کے دیہات کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں اور افسانوں کی تشبیہات اور استعارات سے مختلف ہیں۔ مثلاً

''اس کے اطراف پٹھانوں، کبڑیوں اور جلاہوں کے ملے جلے مکان تھے۔ کمسن لڑکی کی پکائی ہوئی روٹی کی طرح ٹیڑھی میڑھی دیواروں پر بوڑھی عورتوں کے بالوں کی طرح مرو ہے چھپر جھولا کرتے ہیں''

''درختوں کے پھل آنسو بن کر ٹپک گئے۔ زرد پتوں کی لاشوں کے بچھونے بچھ گئے جوگن پروائی نگر نگر دکھ کے بھجن گا گا کر تھک گئی۔ آخر آخر وقت کے طلسمیں چشمے میں جمیل نے اپنے دلدر دھو لیے۔ غم کی گھٹا برس کر کھلی تو نئے روشن آسمانوں پر یہاں سے وہاں تک مستقبل کی دھنک کھڑی تھی۔'' (غبار شب)

''حضرت بلالؓ کی آواز پر جس طرح مسلمان نماز کے لیے لپکتے تھے اسی طرح نائب رسول کے نعرۂ جہاد پر صحراؤں سے مجاہدوں کی آندھیاں اُٹھنے لگیں۔ قبیلوں کے سیلاب چڑھنے لگے۔ جرفؔ کا پورا میدان اُن کے خیموں سے اُبل پڑا۔ نائب رسولؐ اُن کے استقبال کو نکلے تو نعرۂ جہاد سے دشت و جبل کانپنے لگے'' (خالد بن ولیدؓ)

قاضی صاحب کو تخلیقی نثر پر قدرت حاصل ہے۔ غالبؔ اور آزادؔ کی طرح وہ خوبصورت نثر لکھتے ہیں۔ ماحول کے مطابق الفاظ کو شیریں اور لطیف سانچہ بخشتے ہیں۔ کرداروں کی مناسبت

سے زبان لکھنے پر انھیں کمال حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اودھ کے زمینداروں، کسانوں اور نوکروں کی زبان دارا شکوہ، صلاح الدین ایوبی اور خالد بن ولیدؓ کے کرداروں کی زبان سے مختلف ہے۔ قاضی صاحب خود فرماتے ہیں:

''اگر کسی شخص کو زبان پر قدرت ہے تو وہ شیڈس بدل سکتا ہے۔ ہر موضوع کے لیے زبان لائے گا''

ناول اور افسانوں میں ہر موضوع پر قلم چلانے میں قاضی عبدالستار تنہا نظر آتے ہیں۔ اُن کی شناخت اُن کے انفرادی اسلوب اور موضوع کی وجہ سے ہے۔ انھیں اپنے موضوع، زبان اور اسلوب پر فنکارانہ دسترس حاصل ہے۔ اور اس کا سبب ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور اُن کی ذہانت ہے۔

☆☆☆

منتخب افسانے

پریم چند

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زِہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اور رہ رہ کر اس کے منھ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔''

مادھو درد ناک لہجے میں بولا۔ ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟''

''تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی؟''

''تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لیے انھیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے

پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنیا کے فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے، یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے۔ جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ ''جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھسادھ ہوگا، اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے کس کے گھر سے آئے؟''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا:

''مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا ہے میں تو یہاں ہوں ہی۔''

''تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔''

''میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن تک اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔ اور

پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں، کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا! آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں اسے تن کی سُدھ بھی تو نہ ہوگی مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔''

''میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گُڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔''

''سب کچھ آئے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بُلا کر دیں گے۔ میرے نولڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔''

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین وادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اُسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں، کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصّہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصّہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھا۔ اس لیے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے، حالانکہ اس کوشش میں اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا: ''وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی

والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں، سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی سٹپنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری، دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا، کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو، مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا، ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے۔ پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھے مگر وہ ہی کہ دئے جاتے ہیں اور جب سب نے منھ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی، کھڑا نہ ہوا جاتا تھا، چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا، ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا کہ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے! مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھاجاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا ٹھاکر تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے جیسے دو بڑے اژدر کنڈیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا۔ تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اس کے منھ پر مکھیاں بھنک رہی تھی؛ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا، اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی

پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقعہ نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسا چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے، چوری کی علّت میں، وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علّت میں، پوچھا کیا ہے بے گھسوا۔ روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اِس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔''

گھسوا نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا ''سرکار بڑی وپت میں ہوں، مادھو کی گھر والی رات گجر گئی، دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے، دوادارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہو گئے، گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوادارو میں اُٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اُٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟''

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں۔

''چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ، سڑا، یوں تو بُلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔'' مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منھ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں، گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈھورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے۔ کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دیا اور

کسی نے لکڑی، اور دو پہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔
گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ ''لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو!''
مادھو بولا۔ ''ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کچھن چاہیے۔''
''تو کوئی ہلکا سا کچھن لے لیں۔''
''ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی رات کو کچھن کون دیکھتا ہے۔''
کیسا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اُسے مرنے پر نیا کچھن چاہیے۔''
''کچھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔''
''اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔''
دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی۔ کچھ گزک، اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔
کئی کُجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔
گھیسو بولا۔ ''کچھن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔''
مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔
''دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں۔''
''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟''

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کپھن کہاں ہے؟''

گھیسو ہنسا۔ ''کہہ دیں گے کہ روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔''

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا:

''بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔''

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن۔ اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اُڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا ''ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پُن نہ ہوگا۔''

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ ''جرور سے جرور ہوگا۔'' بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکھنڈ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں، آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔''

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

''کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔''

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

''جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمھارا سر۔''

''پوچھے گی تو جرور۔''

''تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گی۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔''

مادھو کو یقین نہ آیا، بولا ''کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔''

گھیسو تیز ہو گیا ''میں کہتا ہوں اسے کچھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔''

''کون دے گا بتاتے کیوں نہیں۔''

''وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا، ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے۔ اور کچھن تیسری بار ملے گا۔''

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی۔ مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا کوئی لہکتا تھا۔ کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منھ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ، کتنے تو چُلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آئے تھے صرف خود فراموشی کا مزا لینے کے لیے، شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ درگور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزا لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں، ۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں پتّل اُٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ''پینے'' کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا ''لے جا، کھوب کھا اور اسیر باد دے جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا اسیر بادا سے جرور پہنچ جائے گا، روئیں روئیں سے اسیر باد دے، بڑے گاڑھے کمائی کے پیسے ہیں۔''

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: ''بیکھنڈ میں جائے گی دادا۔ بیکھنڈ کی رانی بنے گی۔''

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا ''ہاں بیٹا بیکھنڈ میں جائے گی، کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکھنڈ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں، اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔''

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔ تلوّن نشے کی خاصیت ہے، یاس اور غم کا دورہ ہوا۔

مادھو بولا:

''مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دُکھ بھوگا۔ مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر۔''

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ ''کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھُس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہوگئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔''

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا میخانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے، اُچھلے بھی۔ کُودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشے سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

☆☆☆

علی عبّاس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سُنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے، جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا۔

دو بھائی تھے چنّو منّو نام، کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر نانہال جولاہے ٹولی میں تھا اور دادیہال سیّد واڑے میں۔ ماں، پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آتی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لیے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنّو منّو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انھوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنّو منّو کی پرورش کے لیے کچھ روپے دیئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے، اچھے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چنّو ذرا سنجیدہ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منّو لاُبالی تھا۔ اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لیے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انھوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دُور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی ہر

سمت اور ہر محلّے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انھوں نے عاجز آ کر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے، لجاتی سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آ کر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا۔ اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔

اس نے آہستہ سے کہا:

''تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجیے۔''

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہی دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیّدانی بی نے شکل صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹِکی بھی ہے۔ سیدانی بی ان درزی کی حرکات سُن چکی تھیں۔ جب سے اُس کی درزن سدھاری تھی اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہا:

''اچھا! گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمھارے لیے کوئی بندوبست کروں گی۔''

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے ان کی تاریخ یوں بیان کی۔

''رادیانِ صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے، وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔''

ایک صاحب نے پوچھا۔ ''اوراس کے بعد؟''

وہ دونوں شانے اُٹھا کراور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے۔ ''خداہی جانے! شایداس کے بعدفرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔''

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جُز بُز ہوئے۔اس سیرت کی عورت اورشرفاء کے گھر میں۔وہ نیک قدم خودبھی کسی کام کے سلسلہ میں سامنے آئیں۔میر صاحب بل کھانے لگے۔نوکری کرنے آئی تھی۔اگرانکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تواسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔پیٹ کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔اگراپنے ہاں بادیتے ہیں تو گھر میں ماشاءاللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔کہیں چنومنو کی نسل اورنہ بڑھے۔ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوااوروہ مسکرامسکراکر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔پھرمنو کی ماں کو بلوا کرانھوں نے اسے نادرشاہی حکم دے دیا۔''ہم نے منو کی نسبت طے کردی۔اس سے کہہ دوکل اس کا عقد ہوگا۔'' بیچاری جولاہن کو چوں وچرا کی مجال نہ تھی۔وہ ''بہت اچھا'' کہہ کے ہونے والی بہو پرایک نظرڈالنے چلی گئی۔وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبرتھی اس لیے بہت کھُل کے باتیں ہوئیں۔جولاہن اس کے طورطریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی۔میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔اختلاف کا یارانہیں، رہنے کا ٹھکانا انھیں کا دیا ہے، چنو کی نوکری انھیں کی عطا کردہ ہےاور منو کی جوت میں کھیت بھی انھیں کے ہیں۔پھرلالچ بھی تھااپنی خوشی سے شادی کریں گےتو سارا خرچ بھی خودہی اٹھائیں گے۔غرض گھر آئی اوراس نے رات کومنوکومیر صاحب کا فیصلہ سنادیا۔وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا،جلدی سے راضی ہوگیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔منوکونئی دھوتی نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔دلہن کوشاہانہ جوڑااور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اورعقد ہوگیا پھر میر صاحب اوران کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کودیےاوردلہن کواس کے ہاں رخصت کردیا۔

دن بیتتے گئے، مہینے ہوئے،ایک سال ہونے کوآیا مگرمنواوراس کی دلہن کی کوئی شکایت

سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے، کہ دفعتہً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہنچیں۔ معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کُھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اُتارتا ہے اُسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بُری عادت نہ پڑنے پاتی، جولاہن سوائے ''مامتا'' کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انھوں نے حکم دے دیا۔ ''آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔''

مگر میر صاحب کو منّو کی فکر ہو گئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر نہ تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے بُلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ ''اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا اُدھڑ جائے گا۔'' ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ ''اب اگر منّو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔'' غرض منّو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی اور تاڑی بند ہو گئی۔ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہو گیا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں اور منو کی بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیئے تو انھوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انھوں نے کلّہ بہ کلّہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منّو پلنگ سے جھپٹ کے اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات ماری کہ وہ ہائے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول ہو گئیں لیکن بلغم کے ساتھ ساتھ تھوڑا تھوڑا

خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اُٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا، بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ ٹھنا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آ کر سمجھانا پڑا لیکن آہستہ آہستہ سیلاب غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتۂ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتاً چنّو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منّو کی بیوہ کو عدۃ کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنّو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ درد دل بیان ہوئے، تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو چنّو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انھوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک وکیل کی طرح بحثتی رہیں۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں۔ ''چل اے گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے۔ میں خوش، میرا خدا خوش!'' چنّو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سندور کی چٹکی ڈال دی اور اپنے چاروں بچوں سمیت اسی گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو مہینے بیتے، تین مہینے بیتے مگر چوتھے مہینے چنّو کی کمر میں اُچک آ گئی۔ اکڑنا، بر رنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کر چلنے لگا۔ ہم سن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے، اُن کو دکھایا۔ انھوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دن اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس! چنّو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع

میں تو کافی سرور آیا مگر افیون کی خشکی نے دبوچا اور بی چُنیا بیگم مانگتی ہیں دودھ، مکھن، گھی، ملائی اور یہ چیزیں چار روپے کی کمائی میں کہاں نصیب، وہ لگا کھیسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور پیٹیں کھانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا بھاوس نہ سماتا اور افیون کی لت پڑ چکی تھی وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل وجگر کو چھلنی کیا اور چنّو خاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی والے تھے کہ چنّو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلہ میں حاضر تھا۔ ڈلیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے میں کونداپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری۔ منھ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منھ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ ''ارے ماں! ارے ماں!'' چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ بھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا، سنبھلتا، پھسلتا لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بجری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی ''ارے کیا ہو گیا لوگو!'' کہتی ہوئی دوڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

''اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟'' اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

چنّو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلہ گھومنے الٰہ آباد چلی گئی۔

☆☆☆

کرشن چندر

مہالکشمی کا پُل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار مہالکشمی جی کا ایک مندر ہے، اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے تھے۔اس مندر میں پوجا کرنے والے لوگ ہارتے زیادہ ہیں جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دُھلتی ہے اور بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پُل ہے۔ مہالکشمی کے پُل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پُل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ یہاں ہر روز ان ساڑھیوں کو دُھو کر سوکھنے کے لیے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے آر پار جاتے ہوئے لوگ، مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ، گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، گہرا بھورا، مٹ میلا نیلا، قرمزی بھورا، گندا سرخ کنارا گہرا نیلا اور لال۔ وہ لوگ اکثر انھیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے دوسرے لمحے میں گاڑی پُل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔ ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذبِ نظر نہیں رہے۔ کسی زمانہ میں ممکن ہے جب یہ نئی نئی خریدی گئی ہوں، ان کے رنگ خوب صورت اور چمکتے ہوئے ہوں، مگر اب نہیں ہیں۔ متواتر دھوئے جانے سے ان کے رنگوں کی آب و تاب مر چکی ہے اور اب یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے سیٹھے روزمرّہ کے انداز کو لیے بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی

نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انھیں سو بار دیکھیے یہ آپ کو کبھی خوب صورت دکھائی نہ دیں گی۔ نہ ان کا رنگ وروپ اچھا ہے۔ نہ ان کا کپڑا، یہ بڑی سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا ابھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں اُدھڑے ہوئے ٹانکے ہیں کہیں بدنما چتلے داغ جو اس قدر پائدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دُھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ میں ان ساڑھیوں کی زندگیوں کو جانتا ہوں۔ کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں یہ لوگ مہالکشمی کے پُل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے۔ بڑی غریب سی چال ہے میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں۔ اس لیے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے۔ اس لیے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سُن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ اِدھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی۔ مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں، میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں۔ کیوں کہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے۔ جیسا شانتی بائی کی ساڑھی کا اور شاید آپ ان دونوں ساڑیوں میں بڑی مشکل سے فرق محسوس کر سکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں، تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں ایک بڑی لڑکی ہے، دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند سیون مِل کے کپڑے کھاتے میں کام کرتا ہے۔ اُسے بہت جلد جانا ہوتا ہے۔ اس لیے شانتا بائی اپنے خاوند

کے لیے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا رکھتی ہے۔ کیوں کہ صبح اُسے خود برتن صاف کرنے کے لیے اور پانی ڈھونے کے لیے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے۔ اور اب وہ ساتھ میں اپنی چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے اور دوپہر کے قریب چال میں واپس آتی ہے۔ واپس آ کے وہ نہاتی ہیاور اپنی ساڑی دھوتی ہے اور سکھانے کے لیے پُل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے لگ جاتی ہے۔ شانتا بائی کے گھر چولھا اسی وقت سلگ سکتا ہے جب دوسروں کے ہاں چولھے ٹھنڈے ہو جائیں۔ یعنی دوپہر کو دو بجے اور رات کے نو بجے۔ ان اوقات کے بیچ اِدھر اور اُدھر اسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے۔ چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں۔ اس دن شانتا بھی میرے نمستے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھنتی بڑبڑاتی چولھا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور چولھے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے۔ تو شانتا بائی اس کے چینی ایسے نازک رخساروں پر زور زور سے چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی۔ اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیوں کہ اسے دودھ نہیں ملتا۔ اور اسے اکثر بھوک لگتی رہتی ہے اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانا پڑتی ہے۔ اسے اپنی ماں کا دودھ اپنے دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں۔ اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجری اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرنے جاتے ہیں اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اور جب پگار ملتی ہے تو ان

میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کا رُخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لیے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی پی نہیں سکتا۔ ایک دن پیے گا دو دن پیے گا۔ تیسرے دن کی تاڑی کے لیے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے۔ راشن کا خرچہ ہے، بھاجی ترکاری ہے، تیل اور نمک ہے، بجلی اور پانی ہے۔ شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مِل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدری نکمّی ساڑی دیتے ہیں۔ اس کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے، جوڑ کے، گانٹھ کے، ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے۔ اور پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آ جاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ اس لیے کہ یہ میلا بہت دیر سے ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں جھاڑوں دینا ہوتی ہے۔ برتن صاف کرنے ہوتے ہیں۔ تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی۔ وہ اتنی بیوقوف نہیں ہے۔ دو تین بچّوں کی ماں ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے۔ پہنے تھے، انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا۔ جب وہ دھارواڑ میں اپنے گاؤں میں تھی۔ جہاں اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی۔ جہاں میلوں میں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے جہاں کہ باپ کے دھان کے کھیت تھے۔ ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیرو کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی۔ جانے اب وہ پیرؤوں میں مزا ہی نہیں ہے، وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ، وہ چمک و دمک کہاں جا کے مر گئی۔ وہ سارے رنگ کیوں یک لخت بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجھتے مانجھتے، کھانا پکاتے، اپنی ساڑھی دھوتے، اسے پُل کے جنگلے پر لا کر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری پر بہتے جاتے ہیں اور دوسرے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پُل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پُل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں گے تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ بھی ساڑھے پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں۔ اور اتنی دور سے معلوم بھی ہوتے ہیں۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی، لگایا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس پہلی ساڑھی کا ہے اور اس دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھونگ سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اس خاوند کے لیے روتی رہتی ہے۔ جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی ایک آنکھ کانی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لیے نشے میں تھا کہ وہ اس روز مِل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈا اب مِل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور اینٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اسے دمے میں مبتلا کر دیتے۔ اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا۔ ایک خشک اور مسلسل کھنکھار گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا۔ سنائی دیتی رہتی۔ مِل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مِل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا اگر غصے میں آ کے ایک دن اس نے جیونا بائی کی آنکھ نکال لی۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصے پر قربان نہیں کی جا سکتی اور اس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مِل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی۔ ڈھونڈو ایسا نہ تھا۔ اسے اپنی بے کاری کا غم تھا۔ اپنی ۳۵ سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا غم تھا اور سب سے بڑا

رنج اِس بات کا تھا کہ مِل مالک نے چلتے وقت اسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ ۳۵ سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مِل میں کام کرنے کے لیے آیا تھا۔ اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا۔ اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آ کے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ۳۵ سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، سارا خون، اس کا سارا رس چُوس لیا ہو۔ اور اُسے بیکار سمجھ کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو۔ اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مِل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکا یک ڈھونڈو نے غم اور غصّے سے اپنے ہاتھ ملے۔ زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانے میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی، اگر اس کے پاس علاج کے لیے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر، سڑ سڑ کر، خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں، کمپونڈروں اور نرسوں کی بداحتیاطی اور گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہوگئی اور جب جیونا اچھی ہوگئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجھنے کا کام دلوا دیا تھا۔ اور گو وہ اب بوڑھی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی۔ کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا، بھڑکیلا لباس پہنے بیٹھی ہے۔ لیکن جیونا بائی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہ کرے گی، اس کا اسے کبھی

خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔ کیونکہ عورت محبت کے لیے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لیے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہیں چلی آئی تھی۔ جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش کو جلانے کے لیے لے جانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر اُنڈیل دی۔ جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کر رکھی تھی۔ عین اُسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اسے دیکھ کر جیونا کو یقین آ گیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے اس کا پتی، اس کی بیٹی، اس کی عزت، جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں، غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا، شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے ننھا، ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو اس ایک لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہو گئی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کر بیٹھ گئی، ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کے لیے گنے کا رس نکالنے والی مشین میں ٹھونستا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے اور یکا یک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی ہو گئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے۔ اور مٹیالا بھی ہے کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں۔ پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیمون مل اور بکسریا مل کے مزدوروں کو بھی یہی تنخواہ ملتی ہے۔ اس لیے میں بھی انھیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں، کلرک ہوں۔ میں فورٹ میں نوکر ہوں۔ میں دسویں پاس ہوں۔ ٹائپ کر سکتا ہوں۔ میں انگریزی میں لکھ سکتا

ہوں۔ میں اپنے وزیراعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ لیتا ہوں۔ آج تھوڑی دیر بعد ان کی گاڑی مہالکشمی پر آئے گی۔ نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیراعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔ مگر میں اسے اپنے ساتھ لے نہیں جا سکتا کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے، راشن تو روز کم پڑتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات کو سونے کے لیے جگہ بھی کم پڑتی ہے اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینے میں صرف پندرہ دن چلتی ہے۔ باقی پندرہ دن سود خور پٹھان چلاتا ہے اور وہ بھی کیسے گالیاں بکتے جھکتے، گھسٹ گھسٹ کر کسی سست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس ان کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا تو ساوتری کو اپنے گھر یعنی کھولی میں لایا تھا۔ تو میں نے سوچا تھا ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی۔ گوبھی کے نازک نازک پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں۔ جب وہ مسکراتی تو سنیما کی تصویر کی طرح خوبصورت دکھا کرتی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے، وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیتی ہے۔ اور میں تو کچھ بھی کہوں کیسے بھی کہوں کتنی ہی لجاجت سے کہوں وہ تو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سنتا ہوں۔ اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے۔ شاید اسے صرف ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے، مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آ گئی ہے اور ہمارے وزیراعظم نے بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیراعظم کی تقریر جو اخبار میں پڑھی تھی سنائی تو وہ اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے غصے میں آ کر چولھے کے قریب پڑا ہوا

چمٹا میرے سو پر دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں اسی کا نشان ہے۔ مگر آپ انھیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اس مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی کا ہے جو اس نے اوپرا ہاؤس کے نزدیک بھنجی مِل بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اس کھلونے کا ہے جو پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا لیکن جسے ہم خرید نہ سکے۔ اور جسے نہ پا کر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا۔ جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی مجھے کسی سے روپے اُدھار نہ مل سکے اور ساوتری جبل پور نہ جا سکی۔ ایک نشان اس تار کا ہے جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان ..... مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں۔ ان سے چتلے چتلے، گدلے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑھیاں ہیں لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے۔ جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے۔ جیسے یہ سب زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں گی۔ جیسے انھوں نے کبھی ہنستی ہوئی دھنک، افق پر چمکتی ہوئی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی ہے۔ جیسے شانتا بائی کی جوانی ہے وہ جیونا کا بڑھاپا ہے۔ وہ ساوتری کا ادھیڑ پن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑھیاں زندگیاں، ایک رنگ ایک سطح، ایک تواتر ایک مسلسل یکسانیت لیے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جھنبو بھیئے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی۔ کیوں کہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے۔ اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہیں ہو بڑی نحس ہوتی ہے۔ وہ جادو ٹونے کر کے دوسرے کے بچوں کو مار ڈالتی ہے۔ اور بدروحوں کو بلا کے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منھ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھنبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھنبو بھیا مراد آباد کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کر اِدھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اُسے

بہت جلد پوروائل کے گُنی کھاتے میں جگہ مل گئی۔ جھبّو بھیّا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا۔ اسے بیڑی کا، تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستّر اسّی روپئے اکٹھا ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی۔ تاکہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے۔ مگر پھر اس نے سوچا ان ستّر اسّی روپیوں میں کیا ہوگا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی۔ لیکن اس رقم سے وہ مراد آباد جا سکتا تھا۔ جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے جھبّو بھیا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپئے میں خرید لیا۔ اسّی روپیہ اس نے نقد دیئے۔ بیس روپئے اُدھار میں رہے جو اس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کیے۔ بعد میں جھبّو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی۔ دھیرج گاؤں کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبّو بڑا خوش ہوا۔ چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی ذات برادری کی، اپنے ضلع کی، اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سو روپئے میں مل گئی۔ اس نے بڑے چل چلاؤ سے اپنا بیاہ رچایا۔ اور پھر اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلّانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لڑیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبّو اور لڑیا دونوں گاتے تھے۔ اِن کے ہاں کوئی بچّہ نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے ایک توتا پال رکھا تھا۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبّو نہ بیڑی پیے نہ سگریٹ۔ نہ تاڑی، لڑیا بیڑی سگریٹ تاڑی سبھی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ سب کچھ نہیں جاتی تھی۔ مگر جب سے بدمعاش کے پلے پڑی اسے یہ سب باتیں سیکھنا پڑیں اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر لڑیا نے جھبّو پر حملہ کیا اور جھبّو نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر توتا بہت شور مچاتا تھا۔ اور رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چلّا کر وہی گالیاں بکتا جو وہ دونوں بکتے تھے۔ ایک بار تو اس کی گالی سن کر جھبّو غصے میں آ کر طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے لگا تھا۔ مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کر توتے کو بچا لیا۔ توتے کو مارنا بڑا پاپ ہے۔ جیونا نے کہا۔ تمھیں برہمنوں کو بلا کے پرائشچت کرنا پڑے گا اور

تمھیں پندرہ بیس روپے کھُل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبّو نے توتے کو بدرو میں غرق کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو وہ جھبّو کو ایسی شادی پر چاروں طرف سے گالیاں پڑیں۔ وہ خود بھی لڑیا کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور کئی بار اُسے بلاوجہ پیٹا۔ اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اُس کی نگرانی کرتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی کہ کوئی عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے چاہے وہ چھوٹا ہی سا گھر ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو۔ چاہے وہ جھبّو بھیّا ایسا شور مچانے والا۔ زبان دراز، شیخی خورا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو۔ اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا اور جھبّو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پنجرہ جھلا رہی تھی۔ اور اُسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا ہمکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا۔ اور اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبّو کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی اور اس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کر اپنے کندھے پر اُٹھایا۔ اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبّو سے گنی کھاتے کے منیجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس پر جھبّو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دیئے۔ اس پر بہت واویلا مچا۔ اور منیجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کر جھبّو کی خوب ٹھکائی کی۔ اور اسے مِل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبّو بچ گیا۔ ورنہ اس کے مرنے میں کوئی کسر نہیں تھی۔ لڑیا نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اُٹھالی۔ اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی تھی۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے جھبّو کو اچھا کر لیا۔ جھبّو اب بھلا چنگا ہے مگر اب اسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کے اسٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے۔ سیون مل، نیو مل، اولڈ مل، پورا مل، معراج مل۔ لیکن اس کے لیے کسی مِل کی جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور کو گالی

کھانے کا حق ہے۔ گالی دینے کا حق نہیں ہے۔ آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے۔ اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس نے بیڑی، تاڑی سب چھوڑ دی ہے۔ ہاں اس کی ساڑھی، قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹتی جارہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑھی میں پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے۔ اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلانا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑھی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ ساڑھی کا رنگ گدلا سرخ ہے، لیکن کنارا گہرا نیلا ہے اور اُس نیلے میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑھی دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے۔ کیونکہ یہ ساڑھی پانچ روپئے چار آنے کی نہیں ہے۔ اس کا کپڑا، اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ آپ کو دور سے یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہوگی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ اُن سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بہتر ہے۔ اس کا کنارا چمک دار ہے۔ اس کی قیمت پونے نو روپئے ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخی کے گھومنے ہوئے ہتے کی لپیٹ میں آ کے مارا گیا تھا۔ اور اب سولہ برس کی خوبصورت منجولا بیوہ ہے۔ اس کا دل جوان ہے، اس کا جسم جوان ہے۔ اس کی امنگیں جوان ہیں لیکن اب وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مرگیا ہے۔ وہ پٹا بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھٹپھٹاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا۔ کیوں کہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لیے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹا کو تبدیل کرنے کے لیے روپیہ بھی خرچ ہوتا۔ مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے لیکن پٹا تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی جو نامنظور ہوئی۔ کیوں کہ منجولا اپنی غفلت سے مرا تھا۔ اس وجہ سے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا۔ اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑھی پہنے رہی۔ جو اس کے خاوند نے پونے نو روپئے میں اس کے لیے خریدی تھی۔ کیوں کہ اُس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہیں تھی۔ جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مرجانے کے بعد بھی دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی۔ کیوں کہ اس کے پاس کوئی

دوسری ساڑھی نہ تھی۔اور جو ساڑھی تھی وہ یہی گدلے سرخ رنگ کی۔ پونے نو روپے کی ساڑھی جس کا رنگ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھی پہنے گی۔ اس کا خاوند زندہ رہتا جب بھی وہ دوسری ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی لاتی۔ اس لحاظ سے اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے۔ ایک سفید ساڑھی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں۔ بیوہ معلوم ہو سکے۔ یہ ساڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ اس ساڑھی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی مضبوط باہیں لپٹی ہیں جیسے اس کے ہر تار پر اُس کے شفاف بوسے مرتسم ہیں، جیسے اس کے تانے بانے میں اس کے خاوند کی گرم گرم سانسوں کی حدّت آمیز غنودگی ہے۔ اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے یہ ساڑھی نہیں ہے۔ ایک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے پر مجبور ہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے۔ لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اسے پہننے والی مر چکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ روز کی طرح دھلی دھلائی ہوا میں جھول رہی ہے۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا ستیو، وہ اب جیل میں ہے۔ ستیو کی بیوی اور اس کا لڑکا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب دیوار کے نیچے پڑے رہتے ہیں۔ ستیو اور ستیو کی بیوی اور اس کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لیے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لیے اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا جتنا ہم لوگوں کو ملتا ہے اس لیے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں، وہیں کھانا پکاتے ہیں، وہیں پڑ کے سو رہتے ہیں۔ یہیں یہ بڑھیا مائی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اِس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں۔ پلّو کے قریب، یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی، نہیں، وہ اس ہڑتال میں حصّہ نہیں لے رہی تھی، وہ بے چاری تو بہت بوڑھی تھی۔ چل پھر نہ سکتی تھی۔ اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا ستیو اور دوسرے بھنگی شامل تھے۔ یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے۔ اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے۔ یعنی اپنی زندگی کے لیے دو وقت کا روٹی کپڑا اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے اس لیے ان لوگوں نے ہڑتال

کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دے دی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا۔ اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا ستیو آگے آگے تھا اور خوب زور وشور سے نعرے لگاتا تھا اور پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی۔ ہم لوگوں نے تو اپنے دروازے بند کر لیے لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا۔ اور پھر ہم کو اپنے بند کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی اِدھر سے اُدھر چاروں طرف سے چل رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا۔ اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کو دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا۔ اور ہماری چال کے دروازے کے قریب بڑھیا پڑی تھی۔ یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے جس کا بیٹا ستیو اب جیل میں ہے۔ اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہیے تھا مگر کیا کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے۔ مُردوں کی عزّت اور احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑھی جلنے جلانے کے لیے نہیں ہے، تن ڈھکنے کے لیے ہے۔ ہاں کبھی کبھی ستیو کی بیوی اس کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے، کیوں کہ اس میں پچھلے اسّی برسوں کے سارے آنسو اور ساری اُمنگیں اور ساری حسرتیں اور شکستیں جذب ہیں۔ آنسو پونچھ کر ستیو کی بیوی پھر اسی ہمّت سے کام کرنے لگتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کہیں گولی نہیں چلی، کوئی جیل نہیں گیا۔ بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چلنے لگی۔

اے لو، باتوں باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لیے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لیے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے۔ اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہالکشمی کے پُل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ یہ چھے ساڑھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں۔ ایسی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں جہاں ایک کونے میں چولھا سلگتا ہے۔ ایک ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ اور ہر طاقچے میں شیشہ ہے۔ کنگھی ہے اور سیندور کی ڈبیہ ہے۔ کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنھیں ہم ہندستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے

بچّوں کی مائیں ہیں۔ ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں۔ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیراعظم صاحب یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا ملک، کوئی بڑا عہدہ، کوئی بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی، یہ ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھیے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں۔ اور جس کے پاس اپنے بچّوں کے اسکول کے لیے فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک توتا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی ہے جس کے خاوند کی زندگی کی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمت ہے۔ یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کی پھال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اُٹھے اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگیں۔

لیکن وزیراعظم صاحب کی گاڑی نہیں رُکی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے کے لیے چوپاٹی چلے گئے۔ اس لیے اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی اِدھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھیے جو مہالکشمی کے پُل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمیں ساڑھیوں کو بھی دیکھیے جنھیں دھوبیوں نے اسی پُل کے دائیں طرف سوکھنے کے لیے لٹکا رکھا ہے۔ اور جو اُن گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہوں کے پانے والے رہتے ہیں۔ آپ کس کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھیے! میں آپ سے اشتراکی بننے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں، میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی کے پُل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول۔ بہر حال دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے۔ وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ باقی جو تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے، سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں۔ لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دل چسپ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ ''زمیندار'' پڑھتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا۔ ''مولبی ساب یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟'' تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ ''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں اُسترے بنتے ہیں۔''

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک اور سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا۔ ''سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔''

دوسرا مسکرا دیا۔ ''مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے۔ ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔''

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرے دار سپاہی اَن پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے؟ اس کا محلِ وقوع کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکّر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا ــــ ''میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں ــــ میں اسی درخت ہی پر رہوں گا۔''

بڑی مشکل کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اُترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں

سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ایس۔سی، پاس ریڈیو انجینئر جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفع دار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علاحدہ علاحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں مبتلا ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرت سر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنھوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی تھی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل بُرا نہ کرے، اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس خیال سے کہ امرت سر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یوروپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت رنج ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اُڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنی پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان پر عجیب وغریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ ''اوپڑی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین۔'' دن میں سوتا تھا، نہ رات میں، پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں۔ مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا ''اوپڑی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔''

لیکن بعد میں ''آف دی پاکستان گورنمنٹ'' کی جگہ ''اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ'' نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ بیک سنگھ کہاں ہے اور جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے، وہ خود اس اُلجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتہ ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے۔ اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لیے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے۔ جن کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمین دار تھا کہ اچانک دماغ اُلٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اُسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے۔ مہینہ کون سا ہے۔ یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار۔ ''اوپڑی گڑبڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف لالٹین'' کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھ میں آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں۔ پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدری کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو یقیناً اُسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک دن بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں، تو اس نے حسبِ عادت قہقہہ

لگایا اور کہا ''وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔''

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ اسے حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا۔''اوپڑی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف وا ہے گورو جی دا خالصہ ایندوا ہے گورو جی کی فتح۔جو بولے سونہال ست سری اکال۔''

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو۔سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

بتادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لیے آیا۔پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا۔''یہ تم سے ملنے آیا ہے۔تمھارا دوست فضل دین ہے۔''

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔''میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی۔تمھارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے۔۔۔مجھ سے جتنی مدد ہو سکی، میں نے کی۔۔۔تمھاری بیٹی روپ کور۔۔۔''

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔۔۔بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔

''بیٹی روپ کور۔''

فضل دین نے رک رک کر کہا۔''ہاں..... وہ..... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔''

بشن سنگھ خاموش رہا۔فضل دین نے کہنا شروع کیا۔''انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔۔۔اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو۔بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے سلام کہنا۔۔۔اور بہن امرت کور سے بھی..... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔''

۔۔۔دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے۔ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔

—— دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مرگئی.....اور.....اور میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں.....اور یہ تمھارے لیے تھوڑے سے مروندے لایا ہوں۔''

بشن سنگھ نے پھر مروندوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا۔''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟''

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا۔''کہاں ہے؟—— وہیں ہے جہاں تھا۔''

بشن سنگھ نے پوچھا۔''پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

''ہندوستان میں۔نہیں نہیں پاکستان میں۔''فضل دین بوکھلا سا گیا۔بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اوپڑدی گڑگڑ دی اینکس دی دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی درفٹے منہ۔'' تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں بن گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو گیا۔سخت سردیاں تھیں۔ جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈ پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کاروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے اُن کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ادھر اُدھر بھاگ اُٹھتے تھے جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔کوئی گالیاں بک رہا ہے۔کوئی گا رہا ہے۔آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔رو رہے ہیں۔ بک رہے ہیں۔کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شور وغوغا الگ تھا۔اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ چند جو کچھ سوچ رہے تھے۔''پاکستان زندہ باد۔'' کے نعرے لگا رہے تھے۔دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور

سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟'' پاکستان میں یا ہندوستان میں؟'' متعلقہ افسر ہنسا۔ ''پاکستان میں۔''

یہ سُن کر بشن سنگھ اُچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔ اور زور زور سے چلّانے لگا۔ ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔''

اُسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو، اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اُسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ اِدھر اُدھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ اِدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

☆☆☆

عِصمت چغتائی

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لیے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مختی سا چڑچڑا بچہ رصد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اُٹھتا۔

''نائیں نائیں میرے لال!'' دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول دھوپ میں پھٹک رہی ہو اور پھر ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں، چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھنٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

''آستین کے لیے گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لیے کترن میری بقچی سے لے لو۔''

اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی

ناپ تول ہار جائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چارگرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس گہری جھرّیاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور انھوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

محلّہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے چمپا چمپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پروئے، نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لیے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔ سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر خمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی امّاں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈھی کے پاس بیٹھی مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ جھپکی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس کے شبنمی دوپٹے بنے، ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری چادر بچھتی۔ محلّہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

''چھوٹے کپڑے کی گونٹ تو اُتر آئے گی، پر بچّیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔''

''لو بوا۔لو اور سنو۔تو کیا نگوڑ ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟''اور پھر سب کے چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول وعرض ناپتی اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی، کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سرڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے اُبھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔اللہ! یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے؟''

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی۔کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔یا تو دولھا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔جو گوٹ میں کان آجائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ذرا سی کترن بھی بچتی تو تِلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے۔سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔حمیدہ کو ایک دم ابا یاد آ گئے۔ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علَم۔ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اُتر آتی۔کھانسی کے دھکّوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔اس کے ننھے سے غصّے

پر وہ ہنستے اور کھانسی سینے میں بے طرح اُلجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہوں۔ پھر بی لتاں آ کر انھیں سہلا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

''توبہ ہے، ایسی بھی کیا ہنسی؟''

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رُک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

''کچھ دوادارو کیوں نہیں کرتے؟ کتنی بار کہا تم سے؟''

''بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔''

''اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کردے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی۔''

''دکھاؤں گا۔'' ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اُچھو لگتا۔

''آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اُٹھا کر۔''

اور ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا کہ جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں، نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اُس کے سینے پر طوفان اُٹھے، اور نہ کبھی ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انھیں اُٹھانے کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ کام نہ آ سکا۔ اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لیے ضد کرنی چھوڑ دی۔ اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی

سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اُٹھ رہی ہے۔

مگر بی امّاں کا دستور نہ ٹوٹا، وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریب کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آ رہا ہے۔ بی امّاں کو تو بس جیسے اک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی۔ اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکّے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منھ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ ''بہن میرا مری کا منھ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔''

اور پھر دونوں میں کُھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں۔ جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اُتار کر منھ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اُڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکّر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتی گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

''اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔'' حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔ صبح راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اُٹھا لیے۔ ''لاؤ میں دھوؤں بی آپا۔'' حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

''نہیں۔'' وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی امّاں مسکراتی رہیں اور کریب کے دوپٹہ میں لپا ٹانکتی رہیں۔ جس

راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اُتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا سانوالہ پانی سے اُتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

''زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔'' وہ حمیدہ کو منھ پھیلاتے دیکھ کر کہا کرتیں۔ اور وہ سوچا کرتی۔ ''ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اُٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جُٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لیے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر اُن پراٹھوں میں بھر دے اور کیوں نہ بھرے۔ آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منھ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھِل اُٹھا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں، ان کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں۔ جیسے وہ کچھ اُن سے کہتے ہوں۔ وہ اُن کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں، بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کاڑھتیں۔ پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا۔ اور بی امّاں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھُسر پھُسر کرتیں۔

''بڑا شرمیلا ہے بے چارہ۔'' بی امّاں تاویلیں پیش کرتیں۔ ''ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتا چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔''

''اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔'' بی امّاں فخر سے کہتیں۔

''اے تو پردا توڑوانے کو کون کہے ہے۔'' بی آپا کے پکّے مہاسوں کو دیکھ کر انھیں بی

امّاں کی دوراندیشی کی داد دینی پڑی۔

''اے بہن، تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی؟'' وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی۔

''اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ واری چل دیوانی۔''

''اے تو میں کیا کروں خالہ؟''

''راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟''

''بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔''

''اے ہے، وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔'' بی امّاں چڑ کر بولیں۔

''نہیں تو، مگر.....'' میں لاجواب ہوگئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں، چپکے سے بولیں۔

''دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''نہیں ہنسوں گی۔'' میں نے وعدہ کیا۔

''کھانا کھا لیجیے۔'' میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹّی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ''اللہ توبہ کیا خنّاس آنکھیں ہیں۔'' جانگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔''

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اُداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں۔ قہقہہ لگاؤں کہ ''واہ جی واہ دولھا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔'' مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی امّاں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان

سے کیا کہتی کہ وہ مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

''راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟'' بی امّاں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

''بتایئے نا؟''

''اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔'' بی امّاں نے ٹھوکا دیا۔

''آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے۔ مزیدار ہی ہوں گے۔''

''ارے واہ رے جنگلی۔'' بی امّاں سے نہ رہا گیا۔

''تمھیں پتہ بھی نہ چلا، کیا مزے سے کھلّی کے کباب کھا گئے۔''

''کھلّی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں؟ میں تو عادی ہو چکا ہوں کھلّی اور بھوسا کھانے کا۔''

بی امّاں کا منھ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دوگنی سلائی کی۔ اور پھر شام کو جب میں کھانا لے کر گئی تو بولے: ''کہیے آج کیا بلائے ہیں؟ آج تو لکڑی کے بُرادے کی باری ہے۔''

''کیا ہمارے یہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟'' میں نے جَل کر کہا۔

''یہ بات نہیں۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلّی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔''

''میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھنسائیں۔ میری بی آپا کو جو شاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔'' میں بھنّا کر چلی آئی۔

بی امّاں کی منھ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصّہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں پھُنکی رہتیں، بی امّاں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں، اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چُبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا۔ کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی میں کھِسیا کر بی آپا

کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کہ کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمھارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے اُلجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اُڑتی ہوئی راکھ..... نہیں..... میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہوگئے۔

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔ اونہہ! میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

''آپ ہم سے خفا ہوگئیں؟'' راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' بی آپا نے شرم وحیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منھ تکنے لگی۔

''کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں..... اوہ نہیں..... کھا نہیں بلکہ چوم لوں۔''

میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میری آنسو نکل آئے۔ ''یہ ہاتھ''۔ میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ بیکس غلام صبح سے شام تک جُٹے ہی رہتے ہیں ان کی بیگار کب ختم ہوگی؟ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا، زور سے چیخ پڑوں۔

''اور کیا کہہ رہے تھے؟'' بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے، پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو..... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

''اور کہہ رہے تھے کہ اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جو شاندہ پیا کریں۔''

''چل جھوٹی۔''

''ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ.....۔''

''ارے چُپ مردار!'' انھوں نے میرا منھ بند کر دیا۔

''دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔''

''نہیں بی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمھاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟'' میں نے کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔

''آپا بی تم خود کیا پہنو گی؟''

''ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھلس رہتی ہے۔''

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا۔

''کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟''

''نہیں تو۔''

''تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔''

میرا جی چاہا کہ اس کا منھ نوچ لوں کمینے۔ مٹّی کے تو دے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگورے جُھلانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے۔ اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کے گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لیے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تا کہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دئے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں ہیں کھنکتی ہیں۔ انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی امّاں کہتی ہیں کہ میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں، بھوک اور کال

کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ چاپ ہو جانے کی باتیں۔

''یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجیے۔ دیکھیے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے؟''

جنگلی بلّی کی طرح میں نے اس کا منھ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے۔ اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھی۔

''وہ بولے؟'' ان سے نہ رہا گیا۔ تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''بی آپا۔ یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔'' میں نے سوچا کہ میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

''کیوں؟'' وہ مسکرائیں۔

''مجھے اچھے نہیں لگتے..... دیکھیے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔'' میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

''بڑے شریر ہیں۔'' انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

''بی آپا..... سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔'' میں نے سلگ کر کہا۔ ''آج میں امّاں سے کہہ دوں گی۔''

''کیا ہوا؟'' بی امّاں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میری چوڑیاں بی امّاں۔''

''راحت نے توڑ ڈالیں۔'' بی اماں مسرت سے بولیں۔

''ہاں!''

''خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔'' پھر چمکار کر بولیں۔ ''خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔'' یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی۔

منھ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو اُمید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر از حد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

''اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم، ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔''

اور وہ مجھے بہنوئیوں کے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انھوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو نمبری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بے چارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجیے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں۔ کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے، پانی آئے، کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے یہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ ''بھئی کس سے؟'' تو کہا۔ ''کسی سے بھی کرا دو۔'' اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔''

''ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟'' بی امّاں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔ جدھر ٹھکا دو اُدھر ہی لڑھک جائے گا۔''

مگر راحت تو بیگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہیں پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر آ بیٹھیں، آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

''کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں اُبھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر اُبھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا۔''

مگر اشاروں کنایوں کے باجود راحت میاں نہ تو خود منھ سے پھوٹے اور نہ ہی اُن کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی امّاں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلّے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی چھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چسانے کو جا بیٹھی۔ بی امّاں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھرّیوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا غبار نہیں اُترا تھا تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بُجھ جاتا۔ اشارے سے انھوں نے مجھے اپنے پاس بُلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھمادی۔

''اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔'' ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دَم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دَم کیا ہوا ملیدہ مراد برلائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولھا کے منھ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے۔ جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے۔

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں..... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ بی امّاں کا چہرہ پھول کی طرح کھِلا ہوا ہے..... بی آپا کی حیا سے بوجھل آنکھیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریہ کا ایک آنسو

ڈھلک کر افشاں کے زرّوں میں قمقمے کی طرح اُلجھ جاتا ہے۔

''یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے۔'' بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے۔'' حمیدہ کا گلا بھر آیا.....

''''جاؤ نہ میری بنو۔'' بی آپا نے اسے جگا دیا۔ اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

''یہ..... یہ ملیدہ۔'' اس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پیر لرز رہے تھے۔ جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا.....! اور منھ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی۔ جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منھ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا۔ نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بُنے گئے۔ دِق نے جو ایک عرصے سے بی آیا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انھیں دبوچ لیا اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اس سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلّے کی بہو بیٹیاں جڑیں کفن کا سفید سفید لٹھا۔ موت کے آنچل کی طرح بی امّاں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان جھرّیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چوپرتہ کیا اور ان کے دل میں اَن گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا۔ جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر..... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر اُبھری ہے اور پھر دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوہا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

☆☆☆

راجندر سنگھ بیدی

اپنے دُکھ مجھے دے دو

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔ جب چکلی بھابی نے پھُسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں ڈھکیل دیا تو اندر سامنے شالوں میں لپٹی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چکلی بھابی اور دریا باد والی پھوپھی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں کہ اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ جب اُسے بیچ رات سے جگایا گیا۔ تو وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''کہاں؟ کہاں لیے جا رہی ہو مجھے؟''

ان عورتوں کے اپنے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا۔ اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ زمین کی یہ بیٹیاں مرد کو تو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہے جس کی طرف بارش کے لیے منہ اُٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منّتیں ماننی پڑتی ہیں۔ چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں، جادو ٹونے کرنے ہوتے ہیں حالانکہ مدن کالکا جی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ میں پڑا اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامتِ اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اُس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ لیتی تھی اور وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔ ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورت کے خون کو راستہ بتانے والا چاند ایک کھڑکی کے راستے سے

اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے۔ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے۔ جیسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تا کہ دلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹک گیا، جبھی اس نے سوچا۔ اندو میری بیوی ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں۔ شالوں میں لپٹی ہوئی دلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، وہاں اندو کا منھ ہوگا۔ اور جب ہاتھ بڑھا کر اُس نے پاس پڑی گٹھری کو چھُوا تو وہیں اندو کا منھ تھا..... مدن نے سوچا تھا۔ وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی۔ لیکن اندو نے ایسا نہ کیا۔ جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو۔ اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑ پھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لیے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایے دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ جیسی دوسر سبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اُٹھنے والے گھنگھریالے بال۔

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو۔ لیکن اتنی دیر کے لیے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یوں ہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلہن کا چہرہ پھر سے اوپر کو اُٹھا دیا۔ اور شرابی سی آواز میں کہا۔ ''اندو!''

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا، اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور صرف اتنا سا کہا ''جی۔'' اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا۔ اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی اب جو چلی سو چلی۔ وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان

کی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت، سبھی کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا۔ جو اُسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چلتی بنی تھی۔ ''جتنی دیر زندہ رہی بے چاری۔'' مدن نے کہا: ''بابو جی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن۔ ۲۸/ مارچ کی شام۔ اور مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا اِدھر اور گگھی سے ذرا اُدھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پَل بھر میں اندو کو اپنے پن سے اِدھر اور بیگانے پن سے اُدھر پہنچا دیا تھا..... مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا۔ لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا ''میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی۔ پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں۔ اس لیے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں..... میں اب تمھاری ہوں۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔''

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریا دلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا۔ ''کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا۔''

''پکّی بات؟'' اندو بولی۔

مدن نے کچھ اُتاؤلے ہو کر کہا۔ ''ہاں ہاں۔ کہا جو پکّی بات۔''

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا۔ میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے، اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ سے باہر ہو، تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملایم ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا:

''تم اپنے دکھ مجھے دے دو۔''

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے آپ پر سے ایک بوجھ بھی اُترتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے پھر چاندنی میں ایک بار پھر اندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہوگا جو اندو نے کہہ دیا۔ جبھی یہ جلتا ہوا آنسو مدن کے

ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا ''دیے۔!'' لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی بہیمیت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکلی بھابی دو بچّوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کی اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریا باد والی پھوپھی جو اپنے ''نو لکھے'' ہار کے گم ہو جانے پر شور مچاتی، واویلا کرتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور جو غسل خانے میں پڑا ہوا مل گیا تھا۔ جہیز میں سے اپنے حصّے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے۔ جن کو ان کے جے۔ پی ہو جانے کی خبر تار کے ذریعے سے ملی تھی اور جو شاید بدحواسی میں مدن کے بجائے دلہن کا منہ چومنے چلے تھے۔

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابی کی ہی بغل میں گھسی رہتی۔ گلی محلّے کی کوئی عورت دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے۔ دیکھے تو کتنی دیر تک دیکھے۔ یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی۔ لیکن کالکا جی کی اس نئی آبادی کے لوگ اب بھی آتے جاتے۔ مدن تو اس کے سامنے رُک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انھیں دیکھتے ہی ایک دم گھونٹ کھینچ لیتی۔ لیکن اِس چھوٹے سے وقفے میں جو کچھ دکھائی دے جاتا، وہ بنا گھونٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آلیا تھا۔ اور وہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بیروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اُسے مہنگے داموں پر خریدنے کو تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی۔ اس پر مدن جلدی ہی دوکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔ گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ جب ہی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اُٹھا اُٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد چھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے بہو۔ بھابی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور اب وہ گھر کے کام کاج میں دل چسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے بڑا تھا، کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب

کندن بھابی کے سواگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا ''کھاؤ بہتم'' وہ کہتا ''وہ بھی کھالیں گے'' اور پھر رسوئی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اُسے روکتے ہوئے کہتے ''رہنے دے بہو برتن صبح ہو جائیں گے۔''

اندو کہتی۔ ''نہیں بابو جی۔ میں ابھی کئے دیتی ہوں جھپاکے سے۔''

تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے۔ ''مدن کی ماں ہوتی بہو، تو یہ سب تمھیں نہ کرنے دیتی.....؟'' اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو۔ چمکی بھابی اور دریا بادوالی پھوپی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا۔ جب سے اندو اُسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی۔ تو وہ گھبرا اُٹھتا اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتا اور ہنستا رہتا پاس آتا تو دور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق سے۔ ایسے میں بابو جی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے۔ اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے۔ ''ارے جانا۔ بھابی پیار کرتی ہے۔ ابھی سے مرد ہو گیا تو؟'' اور دُلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے۔ ''میں تو بھابی کے ساتھ ہی سوؤں گی۔'' کے اصرار نے بابو جی کے اندر کوئی جنار دھن جگا دیا تھا۔ ایک رات اسی بات پر دُلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی، آدھی پکی نالی میں جا گری۔ اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹہ اُڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ ''بابو جی''۔ اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا..... ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس بے ماں کی بچی کو چھاتی سے لگائے ہوئے اندو نے اسے ایک ایسے بستر میں سُلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے، تکئے ہی تکئے تھے۔ نہ کہیں پائنتی تھی، نہ کاٹھ کے بازو۔ چوٹ تو ایک طرف کہیں کوئی چُبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دُلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی ہوئی اسے دکھا بھی رہی تھیں۔ اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دُلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے پیارے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے

ہوئے کہا ''ہائے ری منّی ! تیری ساس مرے، کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں گالوں پر!''

منّی نے منّی کی طرح کہا ''گڑھے تمھارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی۔''

''ہاں منّو !'' اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصہ تھا۔ وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ بولا ''میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔''

''کیوں؟ اچھا کیوں ہے؟'' اندو نے پوچھا۔

''ہاں۔ نہ اُگے بانس نہ بجے بانسری..... ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔''

اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم جاؤ جی سور ہو جا کر..... بڑے آئے ہو ..... آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کی چپ چاپ سے، جھگڑے بھلے۔ جاؤ نہ رسوئی میں تمھارا کیا کام؟''

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے اپنے اپنے بستروں میں یوں جا کر پڑے تھے۔ جیسے دفتروں میں چٹھیاں سارٹ ہوتی ہیں لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اُسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا۔ لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اُسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا۔ لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی تھی۔ جب منّی کو سلانے کے لیے اندو کی لوری کی آواز سنائی دی۔ ''تو آ نندیا رانی، بورائی مستانی۔''

وہی لوری جو دُلاری منّی کو سُلا رہی تھی، مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر سر پر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لپیٹنے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مُردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلہن اندو، اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑی توڑ رہی ہے۔ اور پھر گرتی پڑتی روتی چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولھے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے اور پھر باہر لپک جاتی ہے اور باہیں اُٹھا اُٹھا کر گلی محلّے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے۔ ''لوگو! میں لُٹ

گئی۔'' اب اسے دوپٹے کی پروانہیں۔قمیض کی پرواہ نہیں۔ مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول، اور چڑیاں، جذبات اور خیالات کے طوطے اُڑ چکے ہیں۔ مدن کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہہ رہے تھے۔ حالانکہ رسوئی میں اندو ہنس رہی تھی۔ پَل بھر میں اپنے سہاگ کے اُجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا..... ادھر اندو تو ہنس رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی۔ جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی، دوپٹہ اور دبی دبی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کرڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا..... وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی۔ اندو۔ اور پھر چپ ہوگیا۔ اس اُدھیڑ بن میں وہ بورائی مستانی نندیا بھی اس سے بھی لپٹ گئی۔ ایک اونگھ سی آئی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی، پڑوسی سبطے کی پھینس منھ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اُٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے، دو تین جمائیاں لے کر لیٹ گیا ـــــ سو گیا ـــــ

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں سیدھی کرنے کے لیے کھنک اُٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہوگیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اُٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ سے پھنک رہا تھا اور یہی اُس کے غصّے کا کارن بن گیا۔ جب اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہاں۔

''سو تم ـــــ آ گئیں؟''

''ہاں''۔

''منّی ـــــ سو مر گئی؟''

اندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہوگئی۔ ''ہائے رام'' اس نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے ہاتھ مل کر کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو..... مرے کیوں بیچاری۔ ماں باپ کی ایک ہی بیٹی۔''

''ہاں۔ ہاں'' مدن نے کہا۔ ''بھابی کی ایک ہی نند''۔ اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار

کرتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ منھ مت لگاؤ اس چڑیل کو۔''

''کیوں اس میں کیا پاپ ہے؟''

''یہی پاپ ہے۔'' مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمھارا۔ جب دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ دفان ہی نہیں ہوتی۔''

''ہلـــــ'' اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بہنوں اور بیٹیوں کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیے۔ بیچاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ ایک دن چل ہی دے گی۔'' اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں، باپ بھائی بہن چچا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دُلاری تھی۔ جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہوگئی۔ اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں۔ جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بابنی ہے جس میں کوئی ناگنی رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھنکوائی نہیں جاتی، گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دُور دور سے کیلنے والے، منتھن کرنے والے، دانت پھوڑنے والے، ماندری والے بلوائے گئے اور بڑے بڑے دھنوتری اور موتی ساگر۔ آخر ایک دن اتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی۔ جس میں گوٹے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دلہن بیٹھی تھی۔ پیچھے گھر میں ایک سر پر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی۔

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا۔ ''تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمھیں ہم سے زیادہ پیارے لگتے ہیں؟''

''ہاں!'' اندو نے اثبات میں کہا۔

''یہ سب جھوٹ ہے..... یہ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''تمھارا مطلب ہے میں۔''

''دکھاوا ہے یہ سب۔ ہاں!''

''اچھا جی؟'' اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب دکھاوا ہے میرا؟'' اور اندو اُٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرہانے میں منھ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اُسے

منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کر مدن کے پاس آ گئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو۔ ہوا کیا ہے تمھیں؟'' شوہرانہ رعب داب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آ گیا۔ ''جاؤ جاؤ۔ سو جاؤ جا کے'' مدن نے کہا۔ ''مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔''

''تمھیں کچھ نہیں لینا مجھے تو لینا ہے۔'' اندو بولی۔ ''زندگی بھر لینا ہے۔'' اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا۔ اور وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کے بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہو۔

چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی۔

''پھر مجھے پھاپھا کٹنی کہو گے۔''

''وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔''

''ٹھہرو۔ تمھاری تو۔'' یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو۔ اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا کہا؟'' اور اندو نے اب کی سنائی دینے والی آواز میں دہرایا۔ مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی ''تم مرد لوگ کیا جانو؟۔ جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی عزیز پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ کیا بھائی اور کیا بہن۔'' اور ایکا ایکی کہیں دور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تو دُلاری منّی کا بیاہ کروں گی۔''

''حد ہو گئی۔'' مدن نے کہا۔ ''ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی سوچنے لگیں۔''

''تمھیں ایک ہاتھ کی دکھتی ہے نا؟'' اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کے آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی۔ ''ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو۔'' مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور جب کچھ دیر تک نہ کھولیں۔ تو اندو بولی۔ ''اب کھولو بھی..... اتنی دیر میں تو بوڑھی ہو جاؤں گی۔ جبھی مدن نے آنکھیں کھول دیں۔ لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں منّی بیٹھی ہے اور وہ کھو سا گیا۔

''میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لیے'' اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ''تم کیوں پریشان ہوتے

ہو..... یاد نہیں اپنا وچن؟..... تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو۔''

''ایں؟'' مدن نے چونکتے ہوئے کہا۔ اور جیسے بے فکر ہو گیا۔ لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہاں ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی.....۔

مدن کے لیے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا، خواب کے تاروں سے بنا ہوا۔ آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرکاری سے چکا چوند جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرف عام میں بیوی کہلاتی ہے، لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز، کپڑا ننگا پن ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گرے پڑے تھے، لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھیں، عزت اور پاکیزگی کی ایک سفید اور بے داغ ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور۔۔

مدن کے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوئے، جسے سکھانے کے لیے وہ انھیں اوپر ہوا میں اُٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا، ایک تشنجی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی پھٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا۔ اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا، اندو کا مرمریں جسم خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتذال کے لیے دور..... کبھی جب اندو کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے۔

''ہائے جی، گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں۔ وہ کیا کہیں گے؟''

مدن کہتا۔ ''چھوٹے سمجھتے نہیں۔ بڑے انجان بن جاتے ہیں۔''

اسی دوران بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہو گئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے۔ لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علاحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی آخر زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں

وحشت پیدا کردی۔ لیکن مجبوری تھی، بچے سب دلّی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے اُنھیں بیچ میں اُٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں۔ ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دُلاری کے ساتھ سہارنپور بھیج دیا۔ دھنی رام کی دنیا چمک اُٹھی۔ کہاں اُنھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے بچّوں ہی کی طرح جہاں کپڑے اتارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انھیں سمیٹتے پھرتے۔ اپنے مدن سے دور، السائی ہوئی رتّی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہوگئی تھی۔ وہ رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہاؤس میں گائے، باہر کی طرف منھ اُٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام وام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے۔ جو آنگن میں کھڑا سیکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے ہوئے تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں۔ جھولا کن نے ڈارو رے امریاں ـــــ اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں۔ اَدھیڑ عمر کی بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہوگئی ہے۔ جبھی وہ منھ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گزرتے تو اُسے جگانے، اُٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع نہ پا کر اس شلوار کو جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اُٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں۔ لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے ہی تو نیچے کونے میں نگاہ بہو کے محرم پر پڑ جاتی۔ تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ شتابی کمرے سے نکل بھاگتے جیسے سانپ کا بچہ بل سے باہر آ گیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی ـــــ اوم نمو بھگوتے واسودیوا۔

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک

پہنچادی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے من اور سڈول جسم کی باتیں کرتیں تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے۔ ''ہم تو دھنیہ ہو گئے، امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا۔'' اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں۔ جہاں دِق کے عارضے تھے۔ دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کے بل، نگاہ قریب آتی تو موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے بغل میں جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اُترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی اور آ رہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جا رہی ہے۔ اور ان بچّوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں، کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ سبھی ایک سے، جڑواں توام..... اوم نمو بھگوتے۔

آس پاس کے سب لوگ جان گئے تھے۔ اندو بابو جی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے۔ اور پھر ایک دم سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اندو نے کہا۔ ''بی بی! میرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو۔ اللہ تم کو لچھا دے گا۔'' اندو کے اشارے کی دیر تھی۔ کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا۔ وہ بھی سارٹر، جو نہ ہو سکا اُس کی قسمت، آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اُس کی صحت کا بابو جی خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو باٹی میں پھینٹ، گلاس میں ڈال، بہو کو پلانے کے لیے اُس کی کھٹیا کے پاس آ جاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی۔ ''نہیں بابو جی مجھ سے نہیں پیا جاتا۔''

''تیرا تو سُسر بھی پیے گا۔'' وہ مذاق سے کہتے۔

''تو پھر آپ پی لیجیے نا۔'' اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی۔ اور بابو جی ایک مصنوعی غصّے سے برس پڑتے۔ ''تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟''

ہوں ـــــ ہوں ـــــ اندو لاڈ سے روٹھنے لگی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب

اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اُسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ــــ اور ''لے یہ پڑا ہے ــــ تیری مرضی ہے پی ــــ نہیں مرضی تو نہ پی ــــ'' کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام دُلاری منّی کے پاس کھیلنے لگتے۔ دُلاری کو بابو جی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پھر پیٹ پر منہ رکھ کر پھٹکوا پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابو جی اور منّی یہ کھیل کھیل رہے تھے۔ ہنس ہنسا رہے تھے، تو منّی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دودھ تو خراب ہو جائے گا بابو جی۔ بھابی تو پیتی ہی نہیں۔''

''پئے گی ضرور پئے گی بیٹا'' ــــ بابو جی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹاتے ہوئے کہا۔ ''عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔''

ابھی یہ فقرہ بابو جی کے منہ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے ''ہش ــــ ہے خصم کھائی'' کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا بہو بلّی کو بھگا رہی ہے اور پھر غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو ــــ بھابی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن بابو جی کے پاس آتا اور کہتا۔ ''بو جی ــــ بھابی رو رہی ہے۔''

''ہائیں؟'' بابو جی کہتے اور پھر اُٹھ کر اندھیرے میں دُور اسی طرف دیکھنے لگتے، جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے۔ ''جا ــــ تو سو جا ــــ وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ۔''

اور پھر لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور اپنے من میں بھگوان سے پوچھتے ــــ ''چاندی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟'' اور پھر پورا آسمان اُنھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا۔ اور کانوں میں مسلسل ایک ہاؤ کی آواز سنائی دیتی۔ جسے سنتے ہوئے وہ کہتے۔ ''جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!'' اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے سے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا، اس نے لکھا، میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے، گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ بھیج دیتے ہیں۔ مدن

نے بابو جی کے ایک دوست سے تصدیق کی چٹھی لکھوا بھیجی اِس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار۔ جوابی۔

جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے منھ بات ہی نہ کی۔ یہ دُکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پا کر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی۔ ''اتنا منھ پھلائے بیٹھے ہو ــــ میں نے کیا کیا ہے؟''

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑ ــــ دور ہو جا میری آنکھوں سے ــــ کمینی ــــ''

''یہی کہنے کے لیے اتنی دور سے بلوایا ہے؟''

''ہاں!''

''ہٹاؤ اب۔''

''خبردار ــــ یہ سب تمھارا ہی کیا دھرا ہے۔ جو تم آنا چاہتی تو کیا بابو جی روک لیتے؟''

اندو نے بے بسی سے کہا۔ ''ہائے جی۔ تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بلوا کر بابو جی پر تو بڑا ظلم کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کچھ نہیں ــــ ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔''

''اور میرا جی؟''

''تمھارا جی؟۔ تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔'' اندو نے شرارت سے کہا اور اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور بولا۔ ''بابو جی تم سے بہت خوش تھے؟''

''ہاں!'' اندو بولی۔ ''ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔''

''اپنی قسم!''

''اپنی قسم نہیں ـــــ میری قسم کھاؤ۔''

''تمھاری قسم تو میں نہیں کھاتی ـــــ کوئی کچھ بھی دے۔''

''ہاں!'' مدن نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔''

''سیکس؟'' اندو نے پوچھا ''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔''

''ہائے رام!'' اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''گندے کہیں کے۔ شرم نہیں آتی بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟''

''کیوں؟'' اندو نے بابو جی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔''

''کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔''

''تمھارا من گندا ہے۔'' اندو نے نفرت سے کہا۔ ''اسی لیے تمھارا کاروبار بھی گندے بروجے کا ہے۔ تمھاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمھیں اور تمھاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی۔ تو میرے پتا جی نے مجھ سے اَدِھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی .....وہ تھا نگوڑا۔ جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے'' اور پھر اندو بولی۔ ''بابو جی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جرا بھی جی نہیں لگتا۔ وہ دُکھی ہوں گے تو کیا تم دُکھی نہیں ہو گے؟''

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر مدن ہی پر کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو آنکھیں موند کر پرارتھنا شروع کر دیتا۔

اوم نمو بھگوتے واسودیوا۔ اوم نمو.....اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اُٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے میں جب کہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا۔ ''ابھی رہنے دو بابو جی کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی

بار آزادی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔''

تیسرے چوتھے روز بابو جی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شور پانیوں میں دُھل گئے تھے۔ لکھا تھا۔ ''بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے، تمھاری ماں کے دن، جب ہماری نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی۔ ایسے ہی اُتارے ہوئے کپڑے اِدھر اُدھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندوق، وہی بیسیوں جَل جگن۔ میں بازار جا رہا ہوں، آ رہا ہوں۔ کچھ نہیں تو دہی بڑے یا رَبڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے.....'' اور پھر ایک آدھ سطر اور دھل گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا۔ ''دفتر سے لوٹتے سمے، یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہول سا اُٹھتا ہے.....'' اور پھر۔ ''بہو کا خیال رکھنا۔ اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔''

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹھی پکڑ لی۔ سانس کھینچی، آنکھیں پھیلاتی شرم سے پانی پانی ہوتی ہوئی بولی۔ ''میں مر گئی۔ بابو جی کو کیسے پتہ چل گیا؟''

مدن نے چٹھی چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''بابو جی کیا بچے ہیں؟ ــــ دنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔''

''ہاں مگر''۔ اندو بولی۔ ''ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں۔''

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور جیسے بابو جی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو۔ اس نے ساری کا پلو اس پر کھینچ لیا۔ اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اُس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی۔ ''تمھاری سسرال سے شیرینی آئے گی۔''

''میری سسرال؟ ــــ اوہاں۔'' مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا۔ ''کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کے ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں۔ تسلی سے۔ ''چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟''

''تم۔ یہ سب قصور تمھارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔''

''تمھیں پسند نہیں؟''

''ایک دم نہیں۔''

''کیوں؟''

''چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے۔''

''کیا یہ جندگی کا مجا نہیں؟'' اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا نا؟ پوچھو ان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں۔ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مجاروں پر چوٹیاں باندھتی، شرم وحیا تج کر دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی، شمسانوں میں مسان جگاتی ہیں۔''

''اچھا! اچھا!'' مدن بولا۔ ''تم نے بکھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لیے تھوڑی عمر پڑی تھی؟''

''ہوگا تو!'' اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمھارا نہیں، میرا ہوگا۔ تمھیں تو اس کی جرورت نہیں، پر اس کے دادا کو بہت ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔''

اور پھر کچھ خجل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منھ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پا لینے کے سلسلے میں، اس جان کا ہوتا سوتا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منھ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی۔ ''وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب پیچھے ہوگا۔ پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں..... مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا۔''

مدن بھی جیسے خائف ہو گیا ــــ یہ خوبصورت ''چیز'' جو حاملہ ہو جانے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے مر جائے گی؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا۔ اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا۔ ''تجھے کچھ نہ ہوگا۔ اندو..... میں تو موت کے منھ سے بھی چھین کر

لے آؤں گا تجھے۔اب ساوتری کی نہیں، ستیہ وان کی باری ہے۔''

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے.....

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ لکھا۔البتہ سہارنپور سے ایک سارٹر آیا۔جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے، مدن ڈر گیا۔اندو رونے لگی۔سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں موند لیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا ــــ اوم نمو بھگوتے.....

دوسرے روز ہی مدن نے باپ کو چٹھی لکھی ــــ بابو جی! چلے آؤ..... بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی۔'' لیکن آخر نوکری تھی۔اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے.....ان کے بارے میں دن بہ دن مدن کا احساسِ جرم بڑھنے لگا۔''اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑ جاتا ــــ؟''

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔بیگم دایہ باہر آئی۔اور بولی۔''مبارک ہو بابو جی ــــ لڑکا ہوا ہے۔''

''لڑکا؟'' مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا۔''بی بی کیسی ہے؟''

بیگم بولی۔''خیر مہر ہے۔میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے.....زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنوں نہیں گرتی نا۔''

''او.....'' مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی۔''تمھارا اندر کیا کام؟'' اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی یا شاید اس لیے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو اِرد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔مدن نے سن رکھا تھا۔جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔مدن نے محسوس کیا کہ جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں.....زچگی کے لیے چکلی بھابی تو نہ آئی تھیں کیونکہ اس کا اپنا بچہ تو بہت چھوٹا تھا۔البتہ دریا باد والی پھوپھی ضرور پہنچی تھیں جس نے پیدائش کے وقت رام، رام، رام،

رام کی رٹ لگادی تھی۔ اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اس قدر فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا۔ اور پھوپی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا ــــ ''اندو ٹھیک ہے نا پھوپھی؟''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!'' پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی۔

پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی بچے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اُٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر منّی کے پاس لیٹ گئی۔

اوندھی۔ اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا..... پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح کانپ اٹھی ہے۔

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا۔ جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا۔ جس میں کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اُڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک مرگھلی سی آواز آئی۔

''ہائے ــــ'' اور پھر بچے کے رونے کی آواز۔''

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبا دیا۔ کتوں کو اندر آنے سے روکا لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اُسے ہوش آیا ہے، کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اندو ــــ نند اور جسودھا ــــ اور دوسری طرف نندلال..... اندو نے بچے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے انداز میں بولی۔ ''بالکل تم ہی پر گیا ہے۔''

''ہوگا۔'' مدن نے ایک اچٹتی ہوئی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں تو کہتا ہوں شکر

ہے بھگوان کا کہ تم بچ گئیں۔''

''ہاں!'' اندو بولی۔ ''میں تو سمجھتی تھی ــــ''

''شبھ شبھ بولو۔'' مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تو جو کچھ ہوا ہے..... میں تو اب تمھارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔'' اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبالی۔''

''توبہ کرو۔'' اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھ سے پکڑ لیے..... اور اندو نحیف آواز میں ہنسنے لگی۔

بچہ ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچے کی تلاش کر رہی تھی۔ جواب اس سے پرے، باہر کی دنیا میں جا کر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا کو تک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیئے ہیں اور دیوی بن کر دَیا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے..... مدن نے اندو کے منہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا۔ اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دُبلی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے..... جبھی ایکا ایکی اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لیے۔

''کیا ہوا؟'' مدن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اندو تھوڑا سا اُٹھنے کی کوشش کر کے بولی۔ ''اِسے بھوک لگی ہے۔'' اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''اِسے؟۔ بھوک؟''۔ مدن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں کیسے پتہ چلا؟''

''دیکھتے نہیں؟'' اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی۔ ''سب گیلا ہو گیا ہے۔''

مدن نے غور سے ڈھیلے ڈھالے گلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ بہہ رہا تھا۔ اور ایک خاص قسم کی بو آ رہی تھی۔ پھر اندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے مجھے دے دو!''

مدن نے ہاتھ پنگھوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام

لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اٹھایا جیسے وہ کوئی مرا ہوا چوہا ہے۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دے دیا۔ اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی، ''تم جاؤ ــــ باہر۔''

''کیوں؟''..... باہر کیوں جاؤں؟'' مدن نے پوچھا۔

''جاؤنا۔'' اندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی۔''

''ارے؟ مدن حیرت سے بولا۔ ''میرے سامنے؟..... نہیں پلا سکے گی۔'' اور پھر نا سمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے مڑتے ہوئے اندو پر ایک نگاہ ڈالی۔ اتنی خوبصورت اندو آج تک نہیں لگی تھی۔

بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھِل اُٹھے۔ اُن کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا۔ جو چوبیس گھنٹے انھیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بُری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنی کے برابر پندرہ بیس گولیاں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انھیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے سے ہی بالٹی ایک چوتھائی ہوگئی تھی۔ رات انھیں متلی سی محسوس ہونے لگی اور انھوں نے پکارا۔ ''بہو ذرا داتن تو دینا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔'' بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے کر آئی۔ بابو جی اُٹھ کر داتن چبا ہی رہے تھے کہ ایک ابکائی آئی۔ ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں۔ اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔

منّے کو پیدا ہوئے کُل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے منھ نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا۔ جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کے بجائے اُتار کر رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا

تھا۔ ''لوگو! میں لٹ گئی۔'' کی جگہ اس نے ایک ذل دوز آواز میں چلّانا شروع کر دیا تھا۔ ''لوگو! ہم لُٹ گئے!''

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا۔ اس کا ابھی مدن کو پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منھ میں آ گیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا۔ اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا..... دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو بچالیا تھا۔ چھوٹے بچے کندن، دلاری منّے، پاشی یوں چلّا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بونٹ چونچیں اُٹھا اُٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انھیں اگر کوئی پروں کے اندر سمیٹتی ہے تو اندو۔

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دنیا میرے لیے ختم ہوگئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اُٹھا اور اُٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا۔ ''میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟'' اور وہ کِھل کِھلا کر ہنس رہا تھا۔ حالانکہ اُس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی۔

باپ کو آگ میں حوالے کرنے سے پہلے مدن ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتہ دار محلّہ والے سُن سے رہ گئے۔ پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی، جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی..... عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنویں پر سے نہا کر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی۔ رات کے گھر آنے پر پھر سے ہول میں ڈھل گئی..... اسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جنک دلاری اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا..... اس رات اگر اندو اپنا آپ یوں مدن پر نثار نہ کر دیتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس مہینے کے اندر اندر اندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اِس دوزخ کی آگ میں ڈھکیل کر مدن خود اپنا دُکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا اگر میں شادی کے بعد بابو جی کے پاس گئی ہوئی اندو کو نہ بُلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے۔ لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا..... کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ مجبوراً چل نکلا۔

ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر، چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے منا طرح طرح کی ضد کرتا تھا۔ جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے اندو کا خط آیا۔ مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے، اسے کوئی مارتا تو نہیں؟..... مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جاہل ان پڑھ عورت..... ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا کیا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے؟

سال گزر گئے۔ پیسے کبھی اتنے نہ آئے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے۔ لیکن گزارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دِقت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا..... کُندن کا داخلہ دینا ہے، دُلاری منّی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا۔ اور پھر اندو ایک طرف سے آتی مسکراتی ہوئی اور کہتی۔ ''کیوں دکھی ہو رہے ہو؟'' مدن اُمید بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔ ''دکھی نہ ہوں؟ کُندن کا بی۔اے کا داخلہ دینا ہے..... منّی.....'' اندو پھر ہنستی اور کہتی۔ ''چلو میرے ساتھ۔'' اور مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو، مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا ''مرو گی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا۔'' اور اندو کہتی۔ ''ہاں! لے جاؤں گی۔'' پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

''یہ کہاں سے آ گئے؟''

''کہیں سے بھی آئے..... تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے۔''

''پھر بھی؟''

''تم جاؤ اپنا کام چلاؤ۔''

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی۔ ''میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے نا۔'' اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا، پھر اندو کہتی۔ ''میں چور لٹیرا ہوں ـــــ تم نہیں جانتے؟ ـــــ سخی اور لٹیرا ـــــ جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب گربا کو دے دیتا ہے۔''.....اسی طرح منّی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی لُوٹ کے زیور بکے۔ قرضہ چڑھا اور پھر اُتر بھی گیا۔

ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی ''ہتھ بھرا'' کرتی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں اور بابو جی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابو جی سے کہا۔ ''تم تو بہو کے ہاتھ کی پکی کھا آئے ہو۔ اس کا سکھ بھی دیکھا ہے۔ پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔' اور یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شیو تک پہنچا۔ انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی۔ اور اندو کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی.....

پھر اندو ایسی دیوی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو نند، دیور تو کیا خود مدن سے بھی لڑ پڑتی۔ مدن راست بازی کی اس پُتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں اُلجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے۔ اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچی رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے مدن اپنے شوہری زعم میں کتنا بھی اندو کی بات کو رد کر دے لیکن آخر سب ہی سر جھکائے ہوئے اندو ہی کی شرن میں آتے تھے۔ اور اسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابی آئی کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی۔ لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے اُلٹ چھوٹی بھابی رانی ایک بیوی تھی۔ جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے پی چاچا کی معرفت جائداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائداد تو ایک طرف اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آ گئیں۔ اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ ہو جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس

سکے تھے۔ وہاں اندو کا نیا گھر دنوں ہی میں جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

بچّی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچّی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی جہاں سبھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھوتھو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی۔ لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اٹھتی۔ اور بچّی کو سامنے چھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اُٹھتی۔ ''تو مجھے بھی جینے دے گی ــــ ماں ــــ؟''

اور بچّی چلا چلا کر رونے لگتی۔

مدن اندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ بکنے لگا اور مدن نے بہت سا روپیہ اندو سے بالا بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے کے بعد کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔

گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منھ کے پاس پھنکارنے لگی بلکہ بار بار پھنکارنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سایے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے اور اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور لہر آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اُڑ گیا یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منھ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ جبھی روشنی کی چوکور لہر ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتا رونے لگا۔ اور طبل نے اس کی آواز ڈبو دی۔

مدن کو اس کے تصور کے خدّ و خال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک خط غلط لگ گیا یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صناعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبطے کے سامنے پیش کیا۔ پیش ہی نہیں کیا بلکہ منھ پر مارا۔ اُس کو اُٹھا کر سبطے نے بیگم

کے منہ پر دے مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خونین تربوز کا گودا ہے جس کے رگ وریشے بیگم کی ناک اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں۔ کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا اور بیج اُٹھائے اور اندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیئے۔

ایک اندو کے بجائے دو اندو ہو گئیں۔ ایک تو اندو خود تھی۔ اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط۔ جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا۔..... مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر..... نہا دھو کر، اچھے کپڑے پہن کر، مگھئی کی ایک گلوری جس میں خوشبودار قوام لگا ہو، منہ میں رکھ کر..... لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی۔ اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا۔ گالوں پر رُوج لگا رکھی تھی۔ لپ اسٹک کے نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی سے رنگ لیے تھے اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

''کیا بات ہے؟'' آج مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اندو نے مدن سے نظریں بچاتے ہوئے کہا۔ ''آج فرصت ملی ہے۔''

شادی کے پندرہ بیس برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جب چہرے پر جھائیاں چلی آئی تھیں۔ ناک پر ایک سیاہ کاٹھی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تہیں سی دکھائی دینے لگی تھیں..... آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یوں بنی ٹھنی۔ کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔'' مدن نے سوچا اور اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پھر ایک بار مڑ کر اندو کی طرف دیکھا۔ جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی..... یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی کی آنکھوں کو نہ دِکھ سکے..... اندو سچ مچ خوب صورت تھی۔ آج بھی پندرہ سال کے بعد پھولاں، رشیدہ، مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں ان کے سامنے پانی بھرتی تھیں..... پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر ــــــ

آسمان پر کوئی خاص بادل بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا ادھر گھر کی گنگا طغیانی پر

تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی رفتار سے اگر پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا..... اُدھر بچّی رونے لگی۔ ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی۔ مدن نے اس کی آواز سُن کر آنکھیں بند کرلیں، کھولیں تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ جوان عورت بن کر ـــــ نہیں نہیں، وہ اندو تھی، اپنی ماں کی بیٹی، اپنی بیٹی کی ماں۔ جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مسکرائی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرمل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا۔ آج جس کی خوشبو نے بوکھلا دیا تھا۔ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس لیے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے رستا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا..... لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا۔ اس نشے میں اُس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا۔

''اندو۔'' مدن نے کہا ـــــ اور اس کی آواز شادی کی رات والی پکار سے دُوسرا اوپر تھی ـــــ اندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا ـــــ ''جی۔'' اور اُس کی آواز دوسُر نیچے تھی..... پھر آج چاندنی کے بجائے اماوس تھی.....

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دیکھنے لگا ـــــ اس نے کیا کھویا، کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

''یہ کیا؟'' مدن نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تمھاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔''

''یوں ہی۔'' اندو نے کہا اور بچّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''رات بھر جگایا ہے اس چڑیل منیا نے۔''

بچّی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گویا وہ دم سادھے دیکھ رہی تھی۔ اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا؟ واقعی آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ مدن نے پھر غور سے اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں مگر یہ آنسو؟''

''خوشی کے ہیں۔'' اندو نے جواب دیا۔ ''آج کی رات میری ہے۔'' اور پھر ایک

عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ مدن سے چمٹ گئی۔ ایک تلذذ کے احساس سے مدن نے کہا۔ ''آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا۔''

''لیکن تم نے کہا نہیں۔'' اندو بولی۔ ''یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟''

''ہاں!'' مدن بولا۔ ''اپنے دُکھ مجھے دے دو۔''

''تم نے کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔''

''میں نے؟'' مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا۔ وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار۔ ان کی تعلیم، بیاہ شادیاں۔ یہ پیارے پیارے بچے۔ یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔''

''میں بھی یہی سمجھتی تھی۔'' اندو بولی۔ ''لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔'' پھر اندو نے رُک کر کہا۔ ''میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔''

''کیا چیز رکھ لی؟''

اندو کچھ دیر چُپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتی ہوئی بولی۔ ''اپنی لاج۔ اپنی خوشی..... اس وقت تم بھی کہہ دیتے۔ اپنے سُکھ مجھے دے دو۔ تو میں.....''

اور اندو کا گلا رُندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد بولی۔ ''اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔''

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ اَن پڑھ عورت؟۔ کوئی رٹا ہوا فقرہ۔؟ نہیں تو..... یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں، اور آتشیں برادہ چاروں طرف اُڑ رہا ہے.....

کچھ دیر بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے۔ اور بولا۔ ''میں سمجھ گیا اندو۔'' پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے ــــ اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔.....

☆☆☆

حیات اللّٰہ انصاری

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:

''ٹکٹ!''

گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کی گالی دے کر اُسے پھاٹک کے باہر ڈھکیل دیا۔ ''ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟''

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں، ٹھوکریں سہیں۔ بیسیوں بار ریل سے اُتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن پیدل بھی چلنا پڑا، ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے۔ وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے جب میں کلکتہ پہنچا تو کالی مل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ــــــ دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے یا پھر شہر سے میلوں دور ٹھیکہ دار کی جھونپڑیاں جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے، بے ایمان، حرام زادے، ایک وہ سالا تھا بھوندو اور دوسرا تھا بھورا اور وہ ڈائن بھنگوی جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی، وہ ملوں کے مزدور۔ بھائی ہیں بھائی ہیں، مگر مزدوری کا

موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لیے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟۔ جب جیلر نے آ کر مجھے حکم سنایا ہے کہ 'تیری معیاد ختم' تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس ایک دم سے گھر کی یاد آ گئی۔ گھر! کیا چیز ہے؟

گھسیٹے کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آ کر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اُڑا رہی تھی۔ جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر مل تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی۔ مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آ جا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فرّاٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرض کہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اُتر کر اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آ کر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں، اور ایکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آ گیا۔ تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا کائی کی مخملی چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں۔ پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے اکدم پھڑ پھڑا کر تڑپ کر نکل آئیں اور کم سن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اُچکنے کودنے لگیں۔ وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب اُس مسجد کے گرد پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یوں ہی برا تھا اور لیٹا مینار یوں ہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا، بفاتی، بلاتی، پتنو، نولا، سورج، بلّی اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا اور کون کون ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن

دن بھر سیار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا ایک باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی لونڈا ڈاکہ پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آنا فانا میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی آنکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلا کر بھاگے۔ پھر کیا تھا سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی جو گھگھی بندھی ہے اور جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے.....

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آ گئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پتاور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے۔ جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کوؤں کا شور کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ، باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو، ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی، جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا، آنے والی صدائیں اور خوشبو سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پھٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھے پر رکھے، بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

اُدھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور اِدھر قصبہ آ گیا۔ اس کا نشان ایک اکل کھرّا تاڑ

تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لیے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا یہیں دُلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی جہنا ایسی دُلاری جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ منّے کا۔ وہاں بیٹھ کر وہ دُلاری کا انتظار کرتا تھا، تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے۔ شہر جاؤں گا، نوکری کروں گا۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیرالال کی طرح ایک دم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کروں گا۔ اسی وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آ جایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور، اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ، گڑھیاں میں ڈھیلے پھینکے، گنگنائے گی۔ میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی ـــــ بڑی چڑیل تھی نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھُس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات اک دم یاد آ گئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے۔ ہاں یہیں ابّا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبّن میاں کی قمیص کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبّن میاں گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی۔ ''گھسیٹے! گھسیٹے!۔ کدھر مر گیا؟'' ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیے۔ ان کو اُتارو، پھر جرابیں اُتارو، پھر انگلیوں کو تولیے سے پونچھو، پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو۔ شبّن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر کتنا جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتا پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحبن پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ ''پھر پھاڑ لایا؟'' اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں۔'' یہ کہاں سے کھونچا لگایا؟''۔ ''کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔'' ایک

بارشبن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلانے لگے۔ ''ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟'' میں نے جی میں کہا۔ میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے جو کرو۔ بلکہ اب تو تمھارے گھر کا کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آ گئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گا۔ میں اِدھر اُدھر دبکتا پھرتا تھا کہ لتا نے جو میری کھوج میں لگے تھے، دیکھ لیا۔ ''تو شبن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا ــــ سونے کا بٹن۔'' دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن! کلکتہ میں چار پیسے پتہ ملتا ہے جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولھے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لیے بھاگی جا رہی تھیں۔ دروازے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں۔ ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آ گئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینار سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آ گئی۔ جو باجے گاجے لیے مشعلیں جلائے ایک کمزور سی ناؤ پر، چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے آ اُتری تھی۔

بغیا بھی آ گئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اُٹھ کر اماں کا گھرڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا۔ ''موری چھاگل نہ بولے۔'' دن کو کام کاج

کر کے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ۔'' ''اماں روٹی دے، اماں روٹی دے۔'' اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ۔ رو دھو کر اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولھا جلاتی جمیا اور شبراتن! افوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں۔ ادھر ابا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جھونٹے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں ـــــ واہ ری اماں جہاں کسی کا جی خراب ہوا اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے۔ ''ارے آ ترا سر داب دوں۔ اِدھر آ نجر گجرا تاروں۔ چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا۔'' دونوں وقت ملتے نہ چلا''۔ ہر وقت ٹٹکا اُتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے۔ کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے۔ گلے سڑے، کھٹے میٹھے جیسے ہی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود، جھربیریاں، کیتھے اور کیا کیا سب شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اس نے طاق میں رکھ دی۔ میں اِدھر سے آؤں چُرا کر ایک ٹکڑا منھ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا۔ وہ لگے ڈکارنے۔ ''کون کھا گیا؟'' اماں سمجھ گئیں۔ سہولیت سے بولیں۔ ''چوہا کھا گیا ہوگا۔'' ''تو کھا گئی ہے، تو کیا چوہے بلّے گڑ کھاتے ہیں؟'' اماں نے کہا۔ ''کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟'' میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں گے۔ ''واہ کیا مجا ہے۔ جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منھ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون ہوگا؟ ابا اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے؟ ستر اسّی برس کون جیتا ہے۔ جمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیرا تو جوان ہوگا۔ بھورے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ افوہ کلّو کے ناتنوں کی ناتنیں ہوں گی۔ کلّو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

[۱]

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بغیا سے باہر آتے ہی گھیسٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا ـــــ وہ جگہ تھی وہ ـــــ ہاں ـــــ وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اُجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔آدھا جو کھڑا تھا۔اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔چھپر کے سامنے کی طرف چوحدی کی جگہ جھانکڑوں، تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جُلا ایک اڑم تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے میڑھے سائے کیچوؤں اور کن کھجوروں کی طرح زمین پر بجبار ہے تھے۔گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔گھر کی ایک ایک چیز پُکار پُکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں۔تم کو کیا کھلائیں گے؟

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔گھیسٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا، اکبارگی مُرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا۔وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے، اور بار بار بکریوں کے مُوت کی کھراہند اور نابدان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں، ان بالو کے گھروندوں کو ڈھا دیتیں۔گھیسٹے آدھ گھنٹے تک جہاں تہاں کھڑا رہا۔اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلّا رو رہا تھا۔رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا، جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا، بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

''اندر چلی آؤ نا۔''

اس دھوکے سے گھیسٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔اب کی وہ سہارا لینے کو سچ مچ کھکھارا، پھر کہنے لگا:

''کون فقیرا؟''

''ہاں!''

فقیرا ذرا چڑ کر بولا۔''تم کون ہو؟''

''ذرا ادھر آؤ۔''

فقیرانکل کر قریب آیا اور بولا۔ ''تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''ذرا سنو تو بھائی، تم فقیرا ہونا۔''

''ہاں ـــــ کہہ تو دیا۔''

''تم یہیں رہتے ہو۔''

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا:

''میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں۔ تمھارے پاس۔''

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا: ''تو اندر آؤ۔''

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلاوجہ ہریانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔ چھپر کے نیچے ساتھ بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انھیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک چھید ہا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی، اوڑھنے کے لیے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھنے لگا۔ دُبلا پتلا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کُھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں، جیسے کچی دیوار پر برکھا کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ، گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا: ''بھیا تم تو جوانی ہی میں بڑھائے گئے۔''

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

''جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔''

''سچ ہے بھیّا۔ بھورا، جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟''

اب فقیرا اٹھکا۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو۔ گھسیٹے تو نہیں ہو۔''

''ہاں گھسیٹے ہوں اور کون۔ بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آ رہا ہوں۔''

بھیّا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر اُسے لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے، اس کے آنسو دھل دھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ ''اب نہ رو یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے۔ امّاں کو دیکھو گے؟''

گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''امّاں!۔ ہے کیا؟''

''ہاں۔''

چھپرّ کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا:

''وہ پڑی ہے۔''

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں اُدھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کوے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا، بدگوشت ہو یا ورم! جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے بھینچی ہوئی اُلٹی بنڈی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھرّی سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی۔ جیسے گونگا کھانے کو مانگے۔

بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آیا تھا۔ باب۔ باب۔ باب۔ باب۔ باب۔''

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی، جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر چیختے اور رات کو سیار روتے تھے۔

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا: جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے، پھر بھی مانگے جاتی ہے۔''

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا۔ ''اماں۔''

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔

فقیرا نے کہا۔ ''نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔''

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، باب کی آواز نکل رہی تھی، اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے۔ اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا۔ ذرا ذرا سی چیز کے لیے کیسا کیسا ترستی رہی۔

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لیے ترس بھرا پیار اُبل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اُٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا، مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لیے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ''بھیّا! تم ذرا ہاتھ منہ دھولو۔ میں کھانے پینے کا کچھ بستا کروں۔''

فقیرا بھاگتا ہوا بغیا کے اُس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا اُدھار مانگ لایا اور پھر چولھا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آ بیٹھا اور بولا: ''اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا؟''

''نہیں، آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔''

''اب کھیتی نہیں ہوتی؟''

''وہ کب کی بند ہوگئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہوگئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں و ہرکاریاں بوئیں مگر وہ بکیں نہیں بکائیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔''

''بھورے کاہے میں پکڑا گیا؟''

''سونی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہوگیا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی کا ہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا۔ ''فقیرا! مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن، عیس تو کر لیں گے۔ دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا۔ بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔''

''جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟''

جمیا حرام زادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہوگیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے کسی طرح گزر بسر ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔''

ذرا دیر خاموشی رہی، پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا:

''تمھارے جانے کے بعد بھیا وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا جمانا، تھا ابا کہا کرتے تھے کہ ''یہ سب پلے پیٹ بھرے ہیں پیٹ بھرے۔'' سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گزری، جب چولھا نہ جلا ہو۔''

گھیسٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہوگیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف اس طرح تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا۔ ''کہاں کہاں رہے گھیسٹے؟''

''ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گزری وہاں، ملوں کی خاک چھانی، امیدواری میں کام کیا، بھوت گھر میں روئی ڈھوئی، ہفتوں قبض رہتا تھا، چار سال رکشا چلائی، پھر خونچہ لگایا۔ ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لیے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے ویسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رُلائی نہیں آتی

تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔"

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیرا بولا: "بھیّا ذرا چپکے چپکے کھاؤ، اماں سن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی۔"

گھیسٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا۔ "تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔"

"ہاں، مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پالیتی ہے، اور پھر باب، باب کرنے لگتی ہے۔"

گھیسٹے بجھتے انگاروں کی طرح تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منھ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اُتار سکا۔

[۳]

گھیسٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر بکری کا مسکا ملے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا، اپنے میلے کرتے کے چلوے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں، پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سیکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا، جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑ پھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے سُو سُو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اُجاڑ اُجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھیسٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر بکریوں کے مُوت کی کھراہند اور اپنی ماں کی باب، باب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو برے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! افوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کہو یا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک، سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھیسٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں شرم

اور کھنچاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانے دار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا؟ وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں، دمڑی دمڑی کے لیے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلوے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹنا، وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سلی اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں، خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین فاقے کر لینا اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سنگل چائے۔ وہ دھیلے والا پان کا بیڑا! وہ پیسے کی پچیس بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لیے وہ یہاں ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کے ججمانوں کی مار کھائی۔ کھانے پینے کو ترستے رہے، پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لیے شہر بھاگے، وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں، کہا چلو کلکتہ چلو، وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا، کلکتہ کے پچیس برس! افوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، رکشا تک چلائی، سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو، جمانتی لاؤ۔ میں کیسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے، گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے۔ لچھمن بولا۔ دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن جمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دئے، پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ دور ہٹ جاتے تھے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کرتا کہ ایک اچھی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑے، مگر رہے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض اُدھار کر کے پان سگریٹ، دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا سیزر لاؤ، نیمی کٹ لاؤ، یہ لاؤ وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا؟ کہتے ''نہیں ہے صاحب، نہیں ہے ہجور۔'' وہ بھی تماشا کچھ دنوں رہا، نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی، نہ اچھا

سامان تھا۔ اس پر جو کچھ بھی آیا حرام زادی بھنگوئی کھا گئی۔ نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی ـــــ لنگوٹی میں پھاگ ـــــ

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا۔ ''پھر تم نے چُرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمھارا گزارا نہیں ہوسکتا۔ جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔''

گھسیٹے نے جواب دیا۔ ''کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہوگیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ،، روز کا یہی قصہ۔' بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں۔''

''گھر میں حصہ، بکریوں میں حصہ، تو حصہ بٹائے گا؟ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے!''

گھسیٹے گرم ہوکر بولا۔ ''کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لیے تکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟''

فقیرا نے طعن سے کہا: ''ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر تو لے کر جاتے ہیں۔ بلی اتنا روپیہ لایا ہے تو کیسے لایا ہے؟''

اب تو گھسیٹے تلملا اُٹھا۔ وہ سب کچھ سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا، بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا:

''اور تو نے کیا کر لیا ہے چوٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں، اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے۔ میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔''

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔

کچھ دیر یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ

اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔

یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اُٹھتا، روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک بار ٹھنڈی کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہمیشہ کے لیے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آ جاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو، دوارے پھینس بندھی ہو، کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو ساری کے پلو سے تھالی صاف کرے، اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے، اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان۔ چالیس کا سن ہونے کو آیا۔

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اُٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آ جائے۔

ایک زبردست اُمنگ اُٹھی کہ جیسے بنے ایک بار، اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا۔ ''بھیا فقیرا!''

فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آ گیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا: ''میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو کہ جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا، مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں، یہ کریں وہ کریں، سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟''

گھیسٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا: ''اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں ـــــ وہ تو تم مانتے ہی نہیں ـــــ اس میں تمھارا بھی بھلا، ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو، ان کے گھر ہُن برس رہا ہے، ہن کہنے کو ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگلو سیر بھر آٹا اُدھار دے دو، دو کنکڑیاں نمک دے دو، ذرا سی تمباکو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں، دھتکار بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں نہ جائیں تو کریں کیا؟''

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا، گھیسٹے دم لے کر پھر کہنے لگا: ''اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔''

گھیسٹے نے اکدم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:

''ہاں تمھارا سادی بیاہ کرنا ہے روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں سہی۔ ارے ہاں! اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لیے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔''

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھیسٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا۔ مگر تب انھیں سن کر فقیرا کو غصہ آ گیا تھا۔ روپیہ کے لیے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا۔ اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا ہے۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوند جائے، جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے، پیسہ ہے، گھر گرہستی ہے، ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم ہی ان سے روٹی ادھار مانگتے ہیں، وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ہم اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔''

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا گٹھر لے کر نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے۔ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی، دل لگی کرلو، اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سوگئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہوکر بیٹھتے، آس جگانے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کی کوئی فکر نہ تھی، آج جو مایا کے مندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے، ذرا یہ چھپر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے تو پھر ہمارا گھر بس جاتا، ارے ہاں! اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا، وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے، اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے، کیسا گدرایا بدن ہے۔ جیسے پکا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دودھ وہ دوہے، اوپلے وہ تھاپے، دہی وہ متھے، اکیلی جھوؤں پانس اٹھا اٹھا کر کھیتوں میں وہ ڈالے، کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھالے گا پھر میں منھ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے، وہ رمضانی کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روزیوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکبارگی پیچھے سے آ گئی۔ اسے بھاگتے نہ بنی، کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی، پھر وہی جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اس دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

[۴]

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنالی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اٹھالیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب، باب کر کے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا؛

تھا۔ اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور دوسری طرف بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشے کا برتن ہو، ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اُسے چیتھڑوں میں چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں۔ جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لیے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکّو پر آ گئے تو پَو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا: ''کہاں چلے فقیرا؟''

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اُٹھا: ''شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لیے وہاں جا رہے ہیں۔''

''اماں کو لیے؟'' کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اُٹھا۔

''شاباش تم لوگوں کو۔ اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!''

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک گلی میں آ کر ڈولی رکھی گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی، اٹھا کر ٹیک لگا کر بیٹھا دیا اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باب باب کرتے وقت کہیں ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر احتیاط فضول تھی کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔ بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک

گئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے، جیسے بٹھائی گئی تھی ویسی ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بُری رہی۔ ساری کی کرائی پر پانی پھرا جاتا تھا، ضرورت ایجاد کی ماں ہے، فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اس نے تھال پر چمٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا۔ اور جتنا شیرا بہہ آیا اُسے انگلی سے پونچھ پانچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لاکر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً باب باب کر کے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آ گئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیر ازندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا، اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔ گھسیٹے مشاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اُترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیر انو سکھیئے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ کر سہما جاتا ہے، گھسیٹے فقیرے کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کئی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی منمنا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں، چندے چپڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے، جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے، پھیکے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوڑوں کا جنگل اور بدن پر میل کی کہگل، چیتھڑے، ٹھیکرے، میل، آخور، بلغم، ناک، پیپ مکھیاں، جراثیم، فریب، جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی، لوریاں دے دے کر، تھپک تھپک کر سلا دینے والی مہاپاپن بے حسی!

——— اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیر انے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو، چاہے ذلّت ہو، حیوانیت ہو، چاہے انسانیت ہو، مایا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھا راستہ، تنہا راستہ، چھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا: ''ابے ادھر کہا آیا؟ بھاگ یہاں سے۔''

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھپکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سنا کر کہا: ''تمھارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو، ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔''

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو ذرا ذرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹا: ''چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے۔''

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے، کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکاڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اُس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا، گود میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لیے ادھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے ترنوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دے گا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہیے

جس پر آ کر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا، بھوکا ہوں بابا، ایک فقیرنی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگانے لگا۔ ''جب دے گا اللہ ہی دے گا۔'' فقیرا بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیرا چٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا۔ ''اللہ ہر آفت سے بچائے۔'' اس صدا کو اس طرح دینے لگا، جیسے کوئی والنٹیر، انقلاب زندہ باد کہے، کیونکہ دوسری لے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے، دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ دردانگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ یا ایک ایک دو دو پیسے لیے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا اور خوب کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامنے ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ حیلے روزی بہانے موت۔

[۵]

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لیے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے، تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، سیر بھر پچ میل مٹھائی، چٹ پٹے کباب، مولیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پونے دو روپے ملے تھے۔ جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈالی منھ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے پھر مربھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے۔ گویا زندگی بھر کی بھوک۔ اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اُتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اُٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

''لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھالو۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔''

گھسیٹے نے کچھ نکتیاں اس کے منھ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منھ میں

بھر لے۔ فقیر اور گھسیٹے کے لیے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر مانگنے لگتی۔ گھسیٹے جھلا کر بولا۔ ''لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔''

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی مگر چبتا کیا وہ بار بار منہ سے نکل آتا اور پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل لیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پالنے میں جُٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اُسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے تکی تھی، وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا۔ اس کا شیرا ٹھڈی باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں میں بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیز ہی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہ رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا، اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی۔ جس میں چھپر نیا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پُتا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلّہ لیے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم و سرخا سرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں (گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آ گئی ہے) ایک طرف

بکری کا مسکا بھی ہے۔ فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی سی کامیابی! پونے دو روپے اور صرف ایک دن میں! پچاس روپیہ مہینہ! افوہ! اگر ہم کہیں کلکتے میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! سنگل چائے، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں، وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گود میں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب بکریاں اپنی کر لی ہیں۔ حصہ مانگا تو سر ا بگڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر دے دوں گا، بکریاں دے دوں گا، مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا۔ حرامی سالا فقیرا!''

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا۔ ''فقیرا سونا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہیے۔''

''کاہے کا حصہ بانٹ؟''

''ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصہ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہے اُس کا۔'' فقیرا تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔

''پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا ہوا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنوایا ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تُو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟''

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصے میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا: ''اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔''

''ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گؤ مُوت صاف کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی۔ اب جو کمائی کے قابل ہوگئی تو اماں تیری ہے۔ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری، تو لے جائے؟''

گھسیٹے پر بھوت سوار ہوگیا اور وہ غصے میں ماں کی طرف لپکا جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا، مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارہ حد سے اونچا ہوگیا۔ اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ کوئی گٹھری ہے۔ جس طرح بلی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو غوغو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑ سے کھڑے قد نیچے گر پڑا۔ اور بڑھیا چیختی، قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منھ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے، منھ بھیانک ہوگیا اور ہاتھ پاؤں برر گئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہوگیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیچا کی طرح ہونق ہوگیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لیے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا ہے؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کسے پروا ہوتی ہے۔ مر گیا، مر گیا، فقیرا ناحق مرا مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا برا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے۔

اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں۔ میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا، جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو پیاری اماں۔ کلکتہ وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا، دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ، مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منھ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ نکتیاں، گلاب جامن، پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے۔ لوندے کے لوندے۔ زرد زرد پھین۔ گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونا بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا۔ پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ سینکڑوں میل سے درختوں کو تاراج کرتے مردہ پتیوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے۔ وحشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جارہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اُڑا کر لے جائیں گے، گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا کا رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آ گیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا۔ اُمید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھنور منھ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے اُفق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

☆☆☆

خواجہ احمد عباس

ابابیل

اس کا نام تو رحیم خاں تھا، مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامولو ہار کے بچے نے اس کے بیل کی دُم میں کانٹے باندھ دیے تو اس نے مارتے مارتے اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ اگلے دن ضلع دار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھُس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کمبخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں۔ معصوم بچّوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم کی آگ میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا۔ اس کے سامنے کسی کی بھی ہمّت زبان چلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو نے کہہ دیا۔

''ارے بھائی رحیم خاں تو کیوں بچّوں کو مارتا ہے؟''

بس اُس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اُس دن سے لوگوں نے اُس سے بات کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے، اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیے۔ کوئی کہتا تھا کہ اب کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ دلوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اُس کے خلاف گواہی دے کر اُس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اُس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ کاندھے پر ہل دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام دکھ دیے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدّو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا۔

''کیوں بے ٹھو، تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورا کرے گا؟ اور ابے چھدّو! تیری بھی شامت آئی ہے کیا؟''

اور پھر ان غریبوں کی شامت آ جاتی۔ سُوت کی رسّی کی مار سے دونوں بیلوں کی پیٹھ پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو اپنی بیوی بچّوں پر غصہ اُتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک کم ہے، بیوی کو اُدھیڑ ڈالا۔ کوئی بچّہ شرارت کر رہا ہے، اس کو اُلٹا لِٹا کر بیلوں والی رسّی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیتا۔ غرض ہر روز ایک آفت مچی رہتی۔ آس پاس کے جھونپڑے والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اس کی بیوی اور بچّوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو ادھ موئی ہو گئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ کی معلوم ہوتی تھی۔ بچّے جب چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک بار مار کھا کر جو بھاگا تو واپس نہیں لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں رشتے کے ایک چچا رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا۔

''بلاس پور کی طرف جاؤ تو ذرا نورو کو لیتے آنا۔''

پھر کیا تھا۔ آگ بگولہ ہو گیا۔

''میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔''

وہ بدمعاش کیوں موت کے منھ میں آنے لگا تھا۔ دو تین سال بعد چھوٹا لڑکا بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا تو بس بیوی ہی رہ گئی۔ وہ غریب تو اتنی پٹ چکی تھی کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا، وہ اپنے بھائی کو بُلا کر، اُس کے ساتھ اپنے میکے چلی گئی۔ پڑوس کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں کچھ روز کے لیے اپنے میکے رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لیے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی کچھ روز کے لیے اپنے میکے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔

اس کو یقین تھا کہ اب اس کی بیوی کبھی نہیں آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلّی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولہے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا تھا، آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا، بغیر کچھ کھائے پیے ہی پڑ کر سو گیا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اُسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دوہ کر پیا اور حقّہ بھر کر پلنگ پر لیٹ گیا اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اُتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیل کا ایک گھونسلہ نظر آیا تھا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا ایک گھڑونچی لا کر اس پر چڑھا دی اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے۔ اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لیے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اُس پر ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل نے چونچ سے اُس پر حملہ کیا۔

''اری آنکھ پھوڑے گی؟'' اس نے اپنا خوف ناک قہقہہ بھر کر کہا اور گھڑونچی سے اُتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن اس نے کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں اب اس سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا۔ پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا۔ لیکن شام کو سورج چھپنے سے پہلے ہی گھر آ جاتا۔ حقّہ بھر کر پلنگ پر لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی طرف دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے اُڑنے کے قابل ہو رہے تھے۔ اس نے ان دونوں بچوں کے نام اپنے بچّوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لوگوں کو حیرت ضرور تھی کہ مدّت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدّو خوش تھے۔ اُن کی کمروں سے زخموں کے نشان بھی اب قریب قریب غائب ہو گئے تھے۔ رحیم خاں ایک دن کھیت سے جلدی آ رہا تھا۔ کہ کچھ بچے سڑک پر کبڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھتے ہی سب اپنے جوتے

چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا۔

''ارے میں تمہیں کوئی مارتا تھوڑے ہی ہوں۔''

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ جلدی جلدی بیلوں کو ہانکتا ہوا گھر آیا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہوگئی۔ اندر آ کر کواڑ بند کیے اور چراغ جلا کر اُجالا کیا۔ روز کی طرح باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے قریب طاق میں ڈال دیے۔

''ارے نورو! ارے بندو!!'' پکارا۔ مگر وہ باہر نہ آئے۔ گھونسلے میں جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دیے سہمے بیٹھے تھے۔ ٹھیک جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا، وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر تک یہ پانی اسی طرح آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی یہ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ بند کر کے اُترا تو بالکل بھیگ چکا تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں، مگر اس نے پرواہ نہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح اُٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اُسے کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو فکر ہوئی۔ کالو ضلعدار اور کئی کسان شام کو اُسے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔ ''ارے بندو!!! اے نورو!! کہاں مر گئے؟ آج تمہیں کھانا کون دے گا؟''

کچھ ابابیلیں کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

''بے چارہ پاگل ہو گیا ہے۔ کالو ضلعدار نے سر ہلا کر کہا'' صبح کو شفاخانے والوں کو پتہ دیں گے کہ اُسے پاگل خانے بھجوا دیں۔''

اگلے دن صبح جب اس کے پڑوسی شفاخانے والوں کو لے کر آئے اور اس کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائینتی پر چار ابابیلیں خاموش بیٹھی تھیں۔۔

☆☆☆

قُرَۃُ العَیُن حَیدر

نظّارہ درمیاں ہے

تارامائی کی آنکھیں تاروں ایسی روشن ہیں اور وہ گردوپیش کی ہر چیز کو حیرت سے تکتی ہے۔ دراصل تارابائی کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ وہ قحط کی سوکھی ماری لڑکی ہے جسے بیگم الماس خورشید عالم کے ہاں کام کرتے ہوئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں اور وہ اپنی مالکن کے شان دار فلیٹ کے ساز وسامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے کہ ایسا عیش وعشرت اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ گورکھپور کے ایک گاؤں کی بال ودھوا ہے۔ جس کے سسر اور ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے ماما نے جو بمبئی میں دودھ والا بھیّا ہے۔ اسے یہاں بُلا بھیجا تھا۔

الماس بیگم کے بیاہ کو بھی ابھی تین چار مہینے ہی گزرے ہیں۔ ان کی منگورین آیا جوان کے ساتھ آئی تھی ''ملک'' چلی گئی تو ان کی بے حد منتظم خالہ بیگم عثمانی نے، جو ایک نامور سوشل ورکر ہیں۔ ایمپلائمنٹ ایکس چینج فون کیا اور تارابائی پٹ بجنے کی طرح آنکھیں جھپکاتی کمبالا ہل کے ''اسکائی اسکریپر'' گُلِ نسترن کی دسویں منزل پر آن پہنچیں۔ الماس بیگم نے ان کو ہر طرح قابلِ اطمینان پایا۔ مگر دوسرے ملازموں نے ان کو تارابائی کہہ کر پکارا تو وہ بہت بگڑیں۔ ''ہم کوئی پتر یا ہیں؟'' انھوں نے احتجاج کیا۔ مگر اب ان کو تارابائی کے بجائے تارادائی کہلانے کی عادت ہوگئی ہے اور وہ چپ چاپ کام میں مصروف رہتی ہیں اور بیگم صاحب اور ان کے صاحب کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کرتی ہیں۔

الماس بیگم کا اگر بس چلے تو وہ اپنے طرح دار شوہر کو ایک لمحے کے لیے اپنی نظروں سے

اوجھل نہ ہونے دیں اور وہ جوان جہاں آیا کو ملازم رکھنے کی ہرگز قائل نہیں مگر تارا بائی جیسی بے جان اور سگھڑ خادمہ کو دیکھ کر انھوں نے اپنی تجربہ کار خالہ کے انتخاب پر اعتراض نہیں کیا۔

تارا بائی صبح کو بیڈ روم میں چائے لاتی ہے۔ بڑی عقیدت سے صاحب کے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر اِستری کرتی ہے۔ ان کے شیو کا پانی لگاتی ہے۔ جھاڑ پوچھ کرتے وقت وہ بڑی حیرت سے ان خوبصورت چیزوں پر ہاتھ پھیرتی ہے جو صاحب اپنے ساتھ پیرس سے لائے ہیں۔ ان کا وائلن وارڈ روب کے اوپر رکھا ہے۔ جب پہلی بار تارا بائی نے بیڈ روم کی صفائی کی تو وائلن پر بڑی دیر تک ہاتھ پھیرا کی۔ مگر پرسوں صبح حسب معمول جب وہ بڑی نفاست سے وائلن صاف کر رہی تھی تو نرم مزاج اور شریف صاحب (بیگم صاحب تتیا مرچ ہیں)، اسی وقت کمرے میں آ گئے اور اس پر برس پڑے کہ وائلن کو ہاتھ کیوں لگایا اور تارا بائی کے ہاتھ سے چھین کر اُسے الماری کے اوپر پٹخ دیا۔ تارا بائی سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صاحب ذرا شرمندہ سے ہو کر باہر برآمدے میں چلے گئے، جہاں بیگم صاحب بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ویسے بیگم صاحب کی صبحیں ہیئر ڈریسر اور بیوٹی سیلون میں گزرتی ہیں۔ مینی کیور، پیڈی کیور، تاج فِشل۔ ایک سے ایک بڑھیا ساڑیاں، درجنوں رنگ برنگے سلیکس اور عطر کے ڈبے اور گہنے ان کی الماریوں میں پڑے پڑے ہیں۔ مگر تارا بائی سوچتی ہے ''بھگوان نے میم صاحب کو دولت بھی، اِجت بھی اور ایسا سندر پتی بھی۔ بس شکل دینے میں کنجوسی کر گئے۔''

صاحب سنا ہے میم صاحب مس صاجب لوگ کی سوسائٹی میں بے حد مقبول تھے۔ مگر بیاہ کے بعد سے بیگم صاحب نے ان پر بہت سی پابندیاں لگا دی ہیں۔ دفتر جاتے ہیں تو دن میں کئی بار فون کرتی ہیں۔ شام کو کسی کام سے باہر جائیں تو بیگم صاحب کو پتہ رہتا ہے کہ کہاں کہاں گئے ہیں اور ان جگہوں پر فون کرتی رہتی ہیں۔ شام کو سیر و تفریح یا ملنے ملانے کے لیے دونوں میاں بیوی باہر جاتے ہیں تب بھی بیگم صاحب بڑی کڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ مجال ہے جو وہ کسی دوسری لڑکی پر نظر بھی ڈال لیں۔

صاحب نے یہ سارے قاعدے قانون ہنسی خوشی قبول کر لیے ہیں، کیونکہ بیگم صاحب بہت امیر ہیں اور صاحب کی نوکری بھی ان کے دولت مند سسر ہی نے دلوائی ہے، ورنہ بیاہ سے

پہلے صاحب بہت غریب آدمی تھے۔ اسکالر شپ پر انجینیرنگ پڑھنے فرانس گئے تھے۔ واپس آئے تو روزگار نہیں ملا۔ پریشان حال گھوم رہے تھے جب ہی بیگم صاحب کے گھر والوں نے اُنھیں پھانس لیا۔

بڑے لوگوں کی دنیا کے یہ عجیب وغریب قصّے تارا بائی فلیٹ کے مستری (باورچی) حمال اور دوسرے نوکروں سے سُنتی اور اس کی آنکھیں اچنبھے سے جھلملاتی رہتی ہیں۔

خورشید عالم بڑے اچھے وائلن نواز بھی تھے، مگر جب سے بیاہ ہوا ہے، بیوی کی محبت میں ایسے کھوئے کہ وائلن کو ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ اس شادی سے ان کی زندگی بدل گئی اور احسان مندی ایسی شے ہے کہ ایک سنگیت کار اپنی سنگیت کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ خورشید عالم شہر کی ایک خستہ عمارت میں پڑے تھے اور بسوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اب لکھ پتی کی حیثیت سے کمبالا ہل میں فروکش ہیں۔ مرد کے لیے اس کا اقتصادی تحفظ غالباً سب سے بڑی چیز ہے۔

خورشید عالم اب وائلن کبھی نہیں بجائیں گے۔

یہ صرف ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ الماس اپنے ملک التجار باپ کی عالی شان کوٹھی میں مالا بار ہل پر رہتی تھیں۔ وہ سوشل ورک کر رہی تھیں اور عمر زیادہ ہو جانے کے کارن شادی کی امید سے دست بردار ہو چکی تھیں۔ جب ایک دعوت میں ان کی ملاقات خورشید عالم سے ہوئی اور ان کی جہاں دیدہ خالہ بیگم عثمانی نے ممکنات بھانپ کر اپنے ''جاسوس'' کے ذریعہ معلومات فراہم کیں۔ لڑکا یو۔ پی سے ہے۔ یورپ سے لوٹ کر تلاش معاش میں سرگرداں ہے، مگر شادی پر تیار نہیں کیونکہ فرانس میں ایک لڑکی چھوڑ آیا ہے اور اُس کی آمد کا منتظر ہے۔ بیگم عثمانی فوراً اپنی مہم پر جُٹ گئیں۔ الماس کے والد نے اپنی ایک فرم میں خورشید عالم کو پندرہ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ الماس کی والدہ نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا اور الماس سے ملاقاتیں خود بخود شروع ہو گئیں۔ مگر پھر بھی ''لڑکے'' نے ''لڑکی'' کے سلسلے میں کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ دفتر سے لوٹ کر بیشتر وقت انھیں الماس کے ہاں گزارنا پڑتا اور اس لڑکی کی سطحی گفتگو سے اُکتا کر اس پُر فضا بالکنی میں جا کھڑے ہوتے جس کا رُخ سمندر کی طرف تھا۔ پھر وہ سوچتے ایک دن ''اُس'' کا جہاز آ کر اس ساحل سے لگے گا اور ''وہ'' اس میں سے اُترے گی، اسے ہمراہ ہی آ جانا چاہیے تھا مگر پیرس میں

کالج میں اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکنی کے جنگلے پر جھکے افق کو تکتے رہتے۔ الماس اندر سے نکل کر شگفتگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی ''کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ ذرا جھینپ کر مسکرا دیتے۔

رات کے کھانے پر الماس کے والد کے ساتھ ملکی سیاست سے وابستہ ہائی فنانس پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد وہ تھکے ہارے اپنی جائے قیام پر پہنچتے اور وائلن نکال کر دھنیں بجانے لگتے جو ''اس'' کی سنگت میں پیرس میں بجایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہر تیسرے دن ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے اور پچھلے خط میں انھوں نے ''اسے'' اطلاع دی تھی کہ انھیں بمبئی ہی میں بڑی عمدہ ملازمت مل گئی ہے۔ اس ملازمت کے ساتھ جو خوفناک شاخسانے بھی تھے اس کا ذکر انھوں نے خط میں نہیں کیا تھا۔

ایک برس گزر گیا مگر انھوں نے الماس سے شادی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ آخر عثمانی بیگم نے طے کیا کہ خود ہی ان سے صاف صاف بات کر لینا اب عین مناسب ہے۔ مگر تب ہی پرتاپ گڑھ سے تار آیا کہ خورشید عالم کے والد سخت بیمار ہیں اور وہ چھٹی لے کر وطن روانہ ہو گئے۔

ان کو پرتاپ گڑھ گئے چند روز ہی گزرے تھے کہ الماس جواب ان کی طرف سے ناامید ہو چکی تھی ایک شام اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک جرمن پیانسٹ کا کونسرٹ سننے تاج محل گئی۔ کرسٹل روم میں حسب معمول بوڑھے پارسیوں اور پارسنوں کا مجمع تھا اور ایک حسین آنکھوں والی پارسی لڑکی کونسرٹ کا پروگرام بانٹتی پھر رہی تھی۔ ایک شناسا خاتون نے الماس کا تعارف اس لڑکی سے کرایا۔ ''مس پروجا جہانگیر دستور۔'' اور خود آگے چلی گئی۔

الماس نے حسب عادت بڑی ناقدانہ اور تیکھی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کا جائزہ لیا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔

''آپ کا نام کیا بتلایا مسز رستم جی نے؟'' الماس نے ذرا مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔

''پیروجا دستور۔'' لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔

''میں نے آپ کو پہلے کسی کونسرٹ وغیرہ میں نہیں دیکھا۔''

''میں سات برس بعد پچھلے ہفتے ہی پیرس سے واپس آئی ہوں۔''

''سات برس پیرس میں!'' تب تو آپ فرنچ خوب فرفر بول لیتی ہوں گی؟'' الماس نے ذرا ناگواری سے کہا۔

''جی ہاں۔'' پیروجا ہنسنے لگی۔

اب خاص خاص مہمان جرمن پیانسٹ کے ہمراہ لاؤنج کی سمت بڑھ رہے تھے۔ پروجاالماس سے معذرت چاہ کر ایک انگریز خاتون سے اس پیانسٹ کی موسیقی پر بے حد ٹکنیکل قسم کا تبصرہ کرنے میں منہمک ہوگئی۔ لیکن اسی لاؤنج میں پہنچ کر الماس پھر اس لڑکی سے ٹکرا گئی۔ کمرے میں چائے کی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔

''آیئے یہاں بیٹھ جائیں؟'' پیروجا نے مسکرا کر الماس سے کہا۔ وہ دونوں دریچے سے لگی ہوئی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

''آپ تو ویسٹرن میوزک کی ایکسپرٹ معلوم ہوتی ہیں۔'' الماس نے ذرا رکھائی سے بات شروع کی کیونکہ وہ خوب صورت اور کم عمر لڑکیوں کو ہرگز برداشت نہ کر سکتی تھی۔

''جی ہاں، میں پیرس میں پیانو کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہی گئی تھی۔''

الماس کے ذہن میں کہیں دور خطرے کی گھنٹی بجی۔ اس نے باہر سمندر کی شفاف اور بے حد نیلی سطح پر نظر ڈال کر دفعتاً بڑے اخلاق اور بے تکلفی سے کہا۔ ''ہاؤ انٹرسٹنگ۔ پیانو تو ہمارے یہاں بھی موجود ہے۔ کسی روز آ کر کچھ سناؤ۔''

''ضرور''۔ پیروجا نے مسرت سے جواب دیا۔

''سنیچر کے روز کیا پروگرام ہے تمھارا۔ میں اپنے ہاں ایک ہین پارٹی (Hen Party) کر رہی ہوں، میری سہیلیاں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

''آئی وڈ لو ٹو کم ـــــ تھینک یو؟

''تم رہتی کہاں ہو پیروجا؟''

پیروجا نے تاردیو کی ایک گلی کا پتہ بتایا۔ الماس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ تاردیو مفلوک الحال پارسیوں کا محلّہ ہے۔

''میں اپنے چچا کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے کوئی

بھائی بہن بھی نہیں۔ مجھے چچا ہی نے پالا ہے۔ وہ لاولد ہیں۔ چچا ایک بینک میں کلرک ہیں۔ پیروجا سادگی سے کہتی رہی۔ پھر اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد سمندر کی پُرسکون سطح کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک کہا۔ ''کیسی عجیب بات ہے۔ پچھلے ہفتہ جب میرا جہاز اس ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصے کے بعد اجنبیوں کی طرح بمبئی واپس پہنچ رہی ہوں۔ یہ بڑا کٹھور شہر ہے۔ تم کو معلوم ہی ہوگا الماس! مخلص دوست یہاں بہت مشکل سے ملتے ہیں مگر میری خوش قسمتی دیکھو کہ آج ہی تم سے ملاقات ہوگئی۔

الماس نے دردمندی کے ساتھ سر ہلایا۔ اُسی لاؤنج میں باتوں کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تم پیرس کیسے گئیں؟''

''مجھے اسکالرشپ مل گیا تھا۔ وہاں پیانو کی ڈگری لینے کے بعد چند سال تک میوزک کالج میں ریسرچ کرتی رہی۔ میں وہاں بہت خوش تھی۔ مگر میرے چچا چچی یہاں بالکل اکیلے تھے۔ وہ دونوں بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ چچی بیچاری تو ضعیف العمری کی وجہ بالکل بہری بھی ہوگئی ہیں۔ میں ان کی خاطر واپس آ گئی اور اس کے علاوہ.....۔''

''ہلو الماس! تم یہاں بیٹھی ہو! چلو جلدی۔ مسز ملگاؤنکر تم کو بلا رہی ہیں۔ ایک خاتون نے میز کے پاس آ کر کہا۔ پیروجا کی بات ادھوری رہ گئی۔ الماس نے اس سے یہ بات کہتے ہوئے معذرت چاہی کہ وہ سنیچر کو صبح گیارہ بجے اس کے لیے کار بھیج دے گی۔ وہ میز سے اُٹھ کر مہمانوں کے مجمع میں کھو گئی۔

سنیچر کے روز پیروجا الماس کے گھر پہنچی جہاں مرغیوں کی پارٹی اپنے عروج پر تھی۔ پیٹلز کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ چند لڑکیاں جنھوں نے چند روز پہلے ایک فیشن شو میں حصہ لیا تھا۔ زور شور سے اس کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ یہ سب لڑکیاں جن کی ماتر بھاشائیں اُردو، ہندی، گجراتی اور مراٹھی تھیں، انگریزی اور صرف انگریزی بول رہی تھیں اور انھوں نے بے حد چست پتلونیں یعنی ''اسٹریچ پینٹس'' پہن رکھی تھیں۔ پیروجا کو ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ ابھی ہندستان واپس نہیں آئی ہے۔ اس کا اپنا فرقہ بے حد مغرب پسند تھا مگر برسوں یورپ میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اجنتا کی زندہ تصویروں کی بجائے ان مغربیت زدہ ہندستانی خواتین کو دیکھ

کر اہل یورپ کو سخت افسوس اور مایوسی ہوتی ہے۔ چنانچہ پیرو جا جہانگیر دستور پیرس اور روم میں اپنی ٹھیٹھ ہندستانی وضع قطع پر بڑی نازاں رہتی تھی۔ بمبئی کی ان نقلی امریکن لڑکیوں سے اُکتا کر وہ بالکنی میں جا کھڑی ہوئی جس کے سامنے سمندر تھا اور پہلو میں برج خموشاں کا جنگل نظر آ رہا تھا۔ وہ چونک اُٹھی گھنے جنگل کے اوپر کھلی فضاؤں میں چند گدھ اور کوّے منڈلا رہے تھے اور چاروں طرف بڑا ڈراؤنا سناٹا طاری تھا۔ وہ گھبرا کر واپس پہنچی اور زندگی سے گونجتے ہوئے کمرے میں آ کر ایک صوفے پر ٹک گئی۔

کمرے کے ایک کونے میں غالباً بطور آرائش اسٹین وے کا گرینڈ پیانو رکھا ہوا تھا۔ لڑکیاں اب ریڈیو گرام پر بیلی بیلا فونٹے کا پرانا کلپسو ''جمیکا فیرویل'' بجا رہی تھیں۔ مغنّی کی دل کش آواز گٹار کی جان لیوا گونج کمرے میں پھیلنے لگی:

Down the way where the nights are gay and the sun shines daily on the mountain top. I took a trip on a saling ship.
And when I reached Jamaia I made a stop but I am sad today
I am on my way and won't be back for many a days.
I had to leane a little girl in kingston town.

الماس چپ چاپ جا کر بالکنی میں کھڑی ہوگئی۔ ریکارڈ ختم ہوا تو اس نے اندر آ کر پیرو جا سے کہا۔ ''ہم لوگ سخت بدمذاق ہیں۔ ایک ماہر پیانسٹ یہاں بیٹھی ہے اور ہم ریکارڈ بجا رہے ہیں۔ چلو بھائی۔ اٹھو۔''

پیرو جا مسکراتی ہوئی پیانو کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''کیا سناؤں؟ میں تو صرف کلاسیکی میوزک ہی بجاتی ہوں۔''

''ہائے۔ پوپ (Pop) نہیں؟ لڑکیوں نے غُل مچایا۔ ''اچھا کوئی انڈین فلم سانگ ہی بجاؤ۔''

''فلم سانگ بھی مجھے نہیں آتے ــــ مگر ــــ مگر ایک غزل یاد ہے ــــ جو مجھے ــــ جو مجھے ــــ'' وہ جھینپ کر ٹھٹک گئی۔

''غزل ــــ؟ اوہ! آئی لو اُردو پوئیٹری'' ــــ ایک مسلمان لڑکی نے جس کے والدین

اہلِ زبان تھے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔

پیرو جانے پردوں پر انگلیاں پھیریں اور ایک انجانی، مسرور پھریری سی آئی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ ایک دل کش دُھن بجانا شروع کی۔

''گاؤ بھی ساتھ ساتھ۔'' لڑکیاں چلائیں۔

''بھئی میں گا نہیں سکتی۔ میرا اردو تلفظ بہت خطرناک ہے۔''

''اچھا اس کے الفاظ بتادو۔۔۔'' ہم لوگ گائیں گے۔''

''وہ کچھ اس طرح ہے۔۔۔'' پیرو جانے کہا۔

''تو سامنے ہے اپنے بتلا کہ تو کہاں ہے

کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے''

چند لڑکیوں نے ساتھ ساتھ گانا شروع کر دیا۔ نظارہ درمیاں ہے۔ نظارہ درمیاں ہے۔ غزل ختم ہوئی تالیاں بجیں۔

''اب کوئی ویسٹرن چیز بجاؤ۔۔۔'' ایک لڑکی نے فرمائش کی۔

''شوپاں کی میڈنز فینسی (Maiden's Fancy) بجاؤں؟ یہ نغمہ میں اور میرا منگیتر ہمیشہ اکٹھے بجاتے تھے پیرس میں۔ وہ وائلن پر میری سنگت کرتے تھے۔۔۔''

''تمھارے منگیتر بھی میوزیشین ہیں؟'' ایک لڑکی نے پوچھا۔

''پروفیشنل نہیں۔ شوقیہ۔'' پیرو جانے جواب دیا اور نغمہ بجانے میں محو ہوگئی۔

اگلے دو ہفتوں میں الماس نے پیرو جا سے بڑی گہری دوستی گانٹھ لی۔ اس دوران میں پیرو جا کو ایک کانونٹ کالج میں پیانو سکھانے کی نوکری مل چکی تھی جو تعطیلات کے بعد ملنے والا تھا۔ ہفتے میں تین بار ایک امریکن کی دس سالہ لڑکی کو پیانو سکھانے کا ٹیوشن بھی اسے مل گیا تھا۔ امریکن کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور وہ اپنا غم بھلانے کے لیے اپنے بچّوں کے ہمراہ بغرض سیاحت ہندستان آیا ہوا تھا اور جوہو میں سَن اور سینڈ میں مقیم تھا۔

تاردیو سے جوہو کا سفر خاصا طویل تھا مگر امریکن پیرو جا کو اچھی تنخواہ دینے والا تھا اور بڑی شفقت سے پیش آتا تھا، پیرو جا اپنی زندگی سے فی الحال بہت خوش تھی۔ چند روز بعد ''وہ''

اپنے وطن سے واپس آنے والا تھا۔ پیروجا نے اسے بمبئی آتے ہی ملازمت اور ٹیوشن ملنے کی اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ ''اسے'' ایک ''اچانک'' سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

ایک روز وہ الماس کے ساتھ اس کی کوٹھی کے باغ میں ٹہل رہی تھی کہ فوارے پر پہنچ کر الماس نے اس سے دفعتاً سوال کیا۔ ''تم نے وہ غزل کہاں سے سیکھی تھی۔''

''اوہ ــــ وہ ــــ؟ پیرس میں!''

''پیرس! ہاؤ انٹرسٹنگ! کس نے سکھائی؟''

''میرے منگیتر نے ــــ''

''اوہ پیرجا ــــ یو ڈارک ہورس ــــ! چارسو بیس! مجھ کو بتایا بھی نہیں اب تک!''

''تمھاری ہی کمیونٹی کے ہیں وہ ــــ''

''اوہ ــــ واقعی ــــ؟'' الماس فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

''میرے باپ دادا دستور تھے مگر میرے چچا بہت روشن خیال ہیں۔ انھوں نے اجازت دے دی ہے۔''

''کیا نام ہے صاحب زادے کا؟''

یہ ناموں کا بھی عجیب قصہ تھا۔ خورشید عالم اس کی نرگسی آنکھوں پر عاشق ہوئے تھے۔ جب پیرس کے ہندستانی سفارت خانے کی ایک تقریب میں پہلی ملاقات ہوئی اور کسی نے اس کا تعارف ''پیروجا'' کہہ کران سے کرایا تو انھوں نے شرارت سے کہا تھا۔ ''لیکن آپ کا نام نرگس ہونا چاہیے تھا ــــ!'' ــــ ''نرگیش؟ نرگیش تو میری آنٹی کا نام ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ ــــ'' خورشید عالم نے ایسی بے تکلفی سے کہا تھا جیسے اُسے ہمیشہ سے جانتے ہوں ــــ ''نرگیش، کھورشیٹ، پیروجا۔ آپ لوگوں نے حسین ایرانی ناموں کی ریڑھ ماری ہے۔ میں آپ کو فیروزہ پکاروں تو کوئی اعتراض ہے؟'' ــــ ''ہرگز نہیں ــــ'' پیروجا نے ہنس کر جواب دیا تھا ــــ اور پھر ایک بار خورشید عالم نے دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ ''تمھاری بہادر آنکھیں ــــ ہفت زبان آنکھیں، جگنو ایسی شہاب ثاقب ایسی، ہیرے جواہرات، روشن دھوپ اور جھلملاتی بارش ایسی آنکھیں ــــ نرگس کے پھول جو تمھاری آنکھوں میں تبدیل ہو گئے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا نام ہے ان صاحب کا؟'' الماس کی تیکھی آواز پر وہ چونکی۔
''کھورشیٹ عالم۔'' اس نے جواب دیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس نے گھبرا کر نظریں اُٹھائیں۔ سیاہ ساری میں ملبوس، کمر پر ہاتھ رکھے، سیاہ اونٹ کی طرح اس کے سامنے کھڑی الماس اس سے کہہ رہی تھی۔ ''کیسا عجیب اتفاق ہے پیروجاڈیر! میرے منگیتر کا نام بھی خورشید عالم ہے وہ بھی وائلن بجاتے ہیں، وہ بھی پیرس سے آئے ہیں اور ان دنوں اپنے والد سے ملنے وطن گئے ہوئے ہیں۔''

اگست کے آسمان پر زور سے بجلی چمکی مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کڑکتی ہوئی بجلی آن کر پیروجا دستور پر گر گئی۔ وہ کچھ دیر تک ساکت بیٹھی رہی پھر اس نے اس عالی شان عمارت پر نظر ڈالی اور اپنے تار دیو کے فلیٹ کا تصوّر کیا، بجلی پھر چمکی اور مالا بار ہل کے اس منظر کو روشن کر گئی۔ چشم زدن میں ساری بات پیروجا کی سمجھ میں آ گئی۔ اور یہ بھی کہ اپنے خطوں میں خورشید عالم نے الماس کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا اور کچھ عرصے سے شادی کے تذکرہ کو وہ اپنے خطوط میں کس وجہ سے ٹال رہے تھے۔
وہ آہستہ سے اُٹھی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اچھا بھئی الماس، منگنی مبارک ہو۔ خدا حافظ۔''
''جا رہی ہو پیروجا؟ ٹھہرو، میری کار تم کو پہنچا آئے گی۔ ڈرائیور۔'' الماس نے سکون کے ساتھ آواز دی۔
''نہیں الماس۔ شکریہ۔'' وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھاٹک سے نکلی۔ سڑک سے دوسری طرف اسی وقت بس آن کر رُکی۔ وہ تیزی سے سڑک پار کر کے بس میں سوار ہو گئی۔
فوّارے کے پاس کھڑی الماس پھاٹک کی طرف دیکھتی رہی۔ بارش کی زبردست بوچھار نے پام کے درختوں کو جھکا جھکا دیا۔ وہ جلدی سے قدم اٹھاتی، کیچڑ سے بچتی برساتی کے اندر چلی گئی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز خورشید عالم کا خط الماس کے والد کے نام آیا جس میں انھوں نے اپنے ابّا میاں کی شدید علالت کی وجہ سے رخصت کی میعاد بڑھانے کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے الماس کے والد کو یہ نہیں لکھا کہ اس خبر سے کہ ان کا اکلوتا لڑکا کسی مسلمان رئیس زادی کے بجائے کسی پارسن سے شادی کر رہا ہے۔ ان کے کٹّر مذہبی ابّا جان صدمے سے جاں بلب

ہو چکے ہیں۔ خورشید عالم کے خط سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد پریشان ہیں۔ جواب میں الماس نے خود انھیں لکھا۔

''آپ جتنے دن چاہیں وہاں رہیے۔ ڈیڈی آپ کو غیر تو نہیں سمجھتے۔ ہم سب آپ کی پریشانی میں شریک ہیں۔ آپ ابا میاں کو علاج کے لیے یہاں کیوں نہیں لے آتے؟''

بربیل تذکرہ کل میں سوئمنگ کے لیے سن اینڈ سینڈ گئی تھی۔ وہاں ایک بڑی دل چسپ پارسن مس پیروجا دستور سے ملاقات ہوئی جو پیانو بجاتی ہے اور پیرس سے آئی ہے اور شاید کسی امریکن کی گرل فرینڈ ہے اور شاید اسی کے ساتھ سن اینڈ سینڈ میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے لکھا کہ غالباً آپ بھی کبھی اس سے ملے ہوں پیرس میں۔

''اچھا ___ اب آپ ابا میاں کو لے کر آ جایئے۔ تار دیجیے تا کہ یہاں برِیچ کینڈی ہسپتال میں ان کے لیے کمرہ ریزرو کر لیا جائے ___

آپ کی مخلص ___ الماس

شام پڑے تاردیو کی خستہ حال عمارت کے سامنے ٹیکسی آ کر رُکی اور خورشید عالم باہر اترے۔ جیب سے نوٹ بک نکال کر انھوں نے پتے پر نظر ڈالی اور عمارت کے لب سڑک برآمدے کی دھنسی ہوئی سیڑھی پر قدم رکھا۔ سامنے یک دروازے کی چوکھٹ پر چونے سے جو ''چوک'' صبح بنایا گیا تھا، وہ اب تک موجود تھا۔ اندر نیم تاریک کمرے کے سرے پر کھڑکی میں ایک بوڑھا پارسی صدرا اور میلی سفید پتلون پہنے، سر پر گول ٹوپی اوڑھے، کمر میں بندھی ''کستی'' کھول کر اس میں گرہیں لگاتے ہوئے زیر لب دعائیں پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف میلی سی آرام کرسی پڑی تھی۔ وسطی میز پر رنگین موم جامہ بچھا تھا۔ دیوار پر زرتشت کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ کمرے میں ناریل اور مچھلی کی تیز باس اُڑ رہی تھی۔ ایک بوڑھی پارسن سرخ جارجٹ کی ساری پہنے، سر پر رومال باندھے منڈیا ہلاتی اندر سے نکلی۔

''مس دستور ہیں۔''

''پیروجا؟ پارسن نے دھندلی آنکھوں سے خورشید عالم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''حد ہو گئی ہے سَن اینڈ سینڈ''

''کیا؟ کیا مس دستور سن اینڈ سینڈ میں منتقل ہوگئی ہیں؟''

بہری پٹ ضعیفہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

''کس کے ــــ کس کے ساتھ ــــ؟'' خورشید عالم نے ہکلا کر پوچھا۔

بوڑھی غراپ سے اندر گئی اور ایک وزیٹنگ کارڈ لا کر خورشید عالم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کارڈ پر کسی امریکن کا نام درج تھا۔

''تم مسٹر کھورشیٹ عالم ہو؟ پیرو جا نے کہا تھا کہ تم آنے والے ہو۔ اگر اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آؤ تو میں فوراً اس کو جوہو فون کر دوں۔ اور تم کو یہ بتاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے؟'' اس نے بلاؤز کی جیب سے پچیس پیسے نکالے۔ خورشید عالم نے ہکا بکا ہو کر بوڑھی کو دیکھا۔

''آپ کو اس صورت حال پر کوئی اعتراض نہیں؟''

بہری بھنڈ ضعیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم بہت غریب لوگ ہیں مگر اب پیرو جا کو ایک امریکن۔'' دفعتاً مسز دستور کو یاد آیا کہ انھوں نے مہمان کو اندر ہی نہیں بلایا ہے اور انھوں نے پیٹھ جھکا کر کہا۔ ''آؤ اندر آ جاؤ۔''

خورشید عالم مبہوت کھڑے رہے۔ پھر تیزی سے پلٹ کر ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

''بائی بائی۔'' ضعیفہ نے ہاتھ ہلایا۔

بوڑھا پارسی دعا ختم کر کے باہر لپکا مگر ٹیکسی زن سے آگے جا چکی تھی۔

جس روز الماس اور خورشید عالم کی منگنی کی دعوت تھی، ایسی ٹوٹ کر بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ ڈنر سے ذرا پہلے بارش تھی اور خورشید عالم اور الماس کے والد کے دوست ڈاکٹر صدیقی جو حال ہی میں تبدیل ہو کر بمبئی آئے تھے۔ بالکنی میں جا کھڑے ہوئے۔ جس سے کچھ فاصلے پر برج خموشاں کا اندھیرا جنگل بھیگی ہوئی ہوائیں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اندر ڈرائنگ روم میں قہقہے گونج رہے تھے اور گرینڈ پیانو پر رکھے ہوئے نقرئی شمعدان میں موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ بڑا سخت رومینٹک اور پُر کیف وقت تھا۔ اتنے میں گیلری میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک ملازم نے آ کر الماس سے کہا۔ ''خورشید صاحب کے لیے فون آیا ہے۔'' دلھن بنی ہوئی الماس لپک کر فون پر پہنچی۔ ایک مقامی ہسپتال سے ایک نرس پریشان آواز میں دریافت کر رہی تھی۔ ''کیا

مسٹر عالم وہاں موجود ہیں؟''

''آپ بتایئے۔ آپ کو مسٹر عالم سے کیا کام ہے؟'' الماس نے درشتی سے پوچھا۔

''مس پیروجا دستور ایک مہینے سے یہاں سخت بیمار پڑی ہیں۔ آج ان کی حالت زیادہ۔ زیادہ نازک ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہلوایا ہے کہ اگر چند منٹ کے لیے مسٹر عالم یہاں آسکیں.....''

''مسٹر عالم یہاں نہیں ہیں۔''

''آر یو شیور؟''

''یس، آئی ایم ویری شیور؟'' الماس نے گرج کر جواب دیا۔ ''کیا آپ سمجھتی ہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں؟'' اور کھٹ سے فون بند کر دیا اور ذرا سر اسیمگی سے مہمانوں میں آ شامل ہوئی۔

دو گھنٹے بعد پھر فون آیا۔

''ڈاکٹر صدیقی آپ کی کال۔'' گیلری میں کسی نے آواز دی۔ ''آپ کو فوراً ہسپتال بلایا گیا ہے۔''

ڈاکٹر صدیقی جلدی سے ٹیلی فون پر گئے۔ پھر انھوں نے الماس کو آوازی۔ ''بھئی معاف کرنا مجھے، بھاگنا پڑ رہا ہے۔''

الماس دروازے تک آئی۔ ''کل ضرور آیئے گا، ہم لوگ ویک اینڈ کے لیے پونا جا رہے ہیں۔''

''ضرور ــــ ضرور ــــ گڈ نائٹ ــــ'' ڈاکٹر صدیقی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

پرتیج کینڈی کے ہسپتال میں صحت یاب ہو کر خورشید الم کے ابا میاں خوش خوش پرتاپ گڑھ واپس جا چکے تھے۔ جب تک کمبالا ہل والا فلیٹ تیار نہیں ہوا تھا، جو دلہن کو جہیز میں ملا تھا۔ شادی کے بعد دولھا میاں سسرال ہی میں رہے۔ اکثر وہ صبح کو دفتر جانے سے قبل بالکنی میں جا کھڑے ہوتے۔ نیچے پہاڑ کے گھنے باغ میں سے گزرتی بل کھاتی سڑک برج خموشاں کی طرف جاتی تھی۔ وقتاً فوقتاً سفید براق کپڑوں میں ملبوس پارسی ''نسیار'' سفید رومالوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے قطاریں بنائے جنازہ اٹھائے دور پہاڑی پر چڑھتے نظر آتے۔ کوّے

اور گدھ درختوں پر منتظر بیٹھے رہتے۔ برج خموشاں کے احاطے کا پھاٹک دور کیمس کارنر پر کھلتا۔ پھاٹک پر ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا خوفناک بوڑھا پھونس پارسی دربان ساکت بیٹھا رہتا تھا۔ سفید ساریوں اور سفید کپڑوں میں ملبوس سوگوار پارسی ''میت چڑھانے'' کے بعد سرسبز پہاڑی سے اُتر کر اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھ جاتے۔ پھاٹک کے باہر زندگی کا پُر جوش سمندر اسی طرح ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ مقابل کی عمارت پر ایرانڈیا کے ''مہاراجہ'' کا اشتہار نت نئے پُر لطف الفاظ میں ان زندہ انسانوں کو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک سے ایک دل چسپ شہروں تک سفر کرنے کی دعوت میں مصروف رہتا۔

''اس'' نے ایک بار خط میں لکھا تھا۔ ''ذہن کی ہزاروں آنکھیں ہیں۔ دل کی آنکھ صرف ایک ہے لیکن جب محبت ختم ہو جائے تو ساری زندگی ختم ہو جاتی ہے۔''

سمندر کی موج پَل کی پَل میں فنا ہو گئی۔ آسمان پر سے گزرنے والے بادل فضا میں تحلیل ہو چکے۔ جب وہ مری ہو گی تو کوّوں اور گدھوں نے اس کا کس طرح سواگت کیا ہو گا۔ اس طوفانی رات کو ہسپتال کے وارڈ سے نکل کر اس کی روح جب آسمانوں پر پہنچی ہو گی اور عالم بالا کے گھپ اندھیرے میں کسی دوسری روح نے اس سے ٹکرا کر پوچھا ہو گا۔ ''تم کون ہو؟'' تو اس نے جواب دیا ہو گا۔ ''پتہ نہیں ـــــ میں کل ہی تو مری ہوں۔''

اب تک اس کی روح کہاں سے کہاں نکل گئی ہو گی۔ مرے ہوئے انسان زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں۔

تارا بائی اپنی روشن آنکھوں سے صاحب کے گھر کی ہر چیز کو ارمان اور حیرت سے دیکھتی ہے۔ وہ صاحب کو حیرت سے تکا کرتی ہے۔ الماس بیگم اب امید سے ہیں۔ بہت جلد تارا بائی کا کام دوگنا بڑھ جائے گا۔

آج صبح آئی اسپیشلسٹ ڈاکٹر صدیقی آئے تھے۔ جب تارا بائی ان کے لیے چائے لے کر برآمدے میں گئی تو وہ چونک پڑے اور خوشی سے پوچھا۔ ''ارے تارا دائی ـــــ تم یہاں کام کر رہی ہو؟''

''جی ڈاگدر صاحب ـــــ'' تارا بائی نے شرما کر جواب دیا۔

''اب صاف بھائی دیتا ہے؟''

''جی ڈاگدر صاحب ـــــ اب سب کچھ بہت صاف بھائی دیت ہے۔''

''گڈ۔ پھر وہ مسٹر اور مسز خورشید عالم سے مخاطب ہوئے۔'' بھئی یہ لڑکی دس سال کی عمر میں اندھی ہوگئی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے اس کا اندھاپن عارضی ثابت ہوا۔ تمھیں یاد ہے الماس تمھاری انگیجمنٹ پارٹی کی رات مجھے ہسپتال بھاگنا پڑا تھا؟ وہاں ایک خاتون مس پیروجا دستور کا انتقال ہوگیا تھا۔ انھوں نے مرنے سے چند روز قبل اپنی آنکھیں آئی بنک کو ڈونیٹ کرنے کی وصیت کی تھی۔ لہٰذا ان کے مرتے ہی مجھے فوراً بلایا گیا کہ ان کی آنکھوں کے ڈلے نکال لوں۔ بے حد نرگسی آنکھیں تھیں بے چاری کی۔ جانے کون تھی غریب۔ ایک بہری بھنڈیا پارسن پلنگ کے سرہانے کھڑی بُری طرح روئے جارہی تھی۔ بڑا الم ناک منظر تھا۔ خیر تو چند روز بعد اس تارا دائی کا ماموں اسے میرے پاس لایا تھا۔ اسے کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ نیا کورینا لگانے سے اس بچی کی بینائی واپس آسکتی ہے۔ میں نے وہی مس دستور کی آنکھیں ذخیرے میں سے نکال کر ان کا کورینا اس لڑکی کی آنکھوں میں گرافٹ کردیا۔ دیکھو کیسی تارا ایسی آنکھیں ہوگئیں اس کی۔ واقعی میڈیکل سائنس آج کل معجزے دکھارہی ہے۔''

ڈاکٹر صدیقی نے بات ختم کرکے اطمینان سے سگریٹ جلالیا ہے۔ مگر الماس بیگم کا چہرہ فق ہوگیا ہے۔ خورشید عالم لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھ کر جیسے اندھوں کی طرح ہوا میں کچھ ٹٹولتے ٹٹولتے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ تارا بائی ان کی یہ کیفیت دیکھ کر بھاگی بھاگی اندر جاتی ہے، تو صاحب پلٹ کر باؤلوں کی طرح اُسے تکنے لگتے ہیں۔ تارا بائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ بوکھلائی ہوئی باورچی خانے میں جاکر برتن دھونے میں مصروف ہوجاتی ہے۔ دور برج خموشاں پر اسی طرح گدھ اور کوے منڈلا رہے ہیں۔

کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیوں ماس
دوئی نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

☆☆☆

قاضی عبدالستار

پیتل کا گھنٹہ

آٹھویں مرتبہ ہم سب مسافروں نے لاری کو دھکا دیا اور ڈھکیلتے ہوئے خاصی دور تک چلے گئے لیکن انجن گنگنایا تک نہیں۔ ڈرائیور گردن ہلاتا ہوا اُتر پڑا۔ کنڈکٹر سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر بیٹھ کر بیڑی سلگانے لگا۔ مسافروں کی نظریں گالیاں دینے لگیں اور ہونٹ بڑبڑانے لگے، میں بھی سڑک کے کنارے سوچتے ہوئے دوسرے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ ایک بار نگاہ اُٹھی تو سامنے دور درختوں کی چوٹیوں پر مسجد کے مینار کھڑے تھے۔ میں ابھی سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط کھردرے دیہاتی ہاتھ نے میری چٹکیوں سے آدھی جلی ہوئی تیلی نکال لی۔ میں اس کی بے تکلفی پر ناگواری کے ساتھ چونک پڑا۔ مگر وہ اطمینان سے اپنی بیڑی جلا رہا تھا، وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا یا بیڑی کھانے لگا۔

''یہ کون گاؤں ہے؟'' میں نے میناروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یو ـــــ یو بھسول ہے۔''

بھسول کا نام سنتے ہی مجھے اپنی شادی یاد آ گئی۔ میں اندر سلام کرنے جا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے ٹوک کر روک دیا۔ وہ کلاسکی کاٹ کی بانات کی اَچکن اور پورے پائنچے کا پاجامہ اور فر کی ٹوپی پہنے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سر اُٹھا کر ان کی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ انہوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمتگاروں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بدھیاں لے لیں اور مجھے پہنانے لگے۔ میں نے بل کھا کر اپنی بنارسی زری پوت کی

جھلملاتی ہوئی شیروانی کی طرف اشارہ کر کے تلخی سے کہا۔ ''کیا یہ کافی نہیں تھی؟'' وہ میری بات پی گئے۔ بدّھیاں برابر کیں۔ پھر میرے ننگے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا ''اب تشریف لے جایئے۔'' میں نے ڈیوڑھی پر کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ بتایا گیا کہ یہ بھسول کے قاضی انعام حسین ہیں۔

بھسول کے قاضی انعام حسین، جن کی حکومت اور دولت کے افسانے میں اپنے گھر میں سُن چکا تھا۔ میرے بزرگوں سے ان کے جو مراسم تھے مجھے معلوم تھے۔ میں اپنی گستاخ نگاہوں پر شرمندہ تھا۔ میں نے اندر سے آ کر کئی بار موقع ڈھونڈ کر ان کی چھوٹی موٹی خدمتیں انجام دیں۔ جب میں چلنے لگا تو انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، مجھے بھسول آنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس رشتے سے پہلے بھی تم میرے بہت کچھ تھے لیکن اب تو داماد بھی ہو گئے ہو۔ اس قسم کے رسمی جملے سبھی کہتے ہیں لیکن اس وقت ان کے لہجے میں خلوص کی ایسی گرمی تھی کہ کسی نے یہ جملے میرے دل پر لکھ دیے۔

میں تھوڑی دیر کھڑا بگڑی بس کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنا بیگ جھلاتا ہوا جُتے ہوئے کھیتوں میں اٹھلاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ سامنے وہ شاندار مسجد کھڑی تھی، جسے قاضی انعام حسین نے اپنی جوانی میں بنوایا تھا۔ مسجد کے سامنے میدان کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مکان کا سلسلہ تھا، جن میں شاید کبھی بھسول کے جانور رہتے ہوں گے، ڈیوڑھی کے بالکل سامنے دو اونچے آم کے درخت ٹرافک کے سپاہی کی طرح چھتری لگائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے جل گئے تھے۔ جگہ جگہ مٹی بھری تھی۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے عمارتوں کا ملبہ پڑا تھا۔ دن کے تین بجے تھے۔ وہاں اس وقت نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد کہ ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے۔ لمبے قد کے جھکے ہوئے، ڈوریے کی قمیض، میلا پائجامہ اور موٹر ٹائر کے تلووں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے، ماتھے پر ہتھیلی کا چھجّہ بنائے مجھے گھور رہے تھے میں نے سلام کیا۔ جواب دینے کے بجائے وہ میرے قریب آئے اور جیسے یک دم کِھل گئے۔ میرے ہاتھ سے میرا بیگ چھین لیا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ڈیوڑھی میں گھس گئے۔

ہم اس چکر دار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے جس کی اندھیری چھت کمان کی طرح جھکی

ہوئی تھی۔ دھنیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہتیر روکے ہوئے تھے۔

وہ ڈیوڑھی سے چلائے۔ ''ارے سنتی ہو۔'' دیکھ تو کون آیا ہے۔ میں نے کہا اگر صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کرلو جلدی سے۔'' لیکن دادی تو سامنے ہی کھڑی تھیں، دُھلے ہوئے گھڑوں گھڑونچی کے پاس دادا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ وہ بھی شرمندہ سی کھڑی تھیں۔ پھر انہوں نے لپک کر گھر کی الگنی پر پڑی مارکین کی دھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹہ کی طرح اوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کُرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند چھپ جائے۔ اس اہتمام کے بعد وہ میرے پاس آئیں۔ کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔ سکھ اور دکھ کی گنگا جمنی آواز میں دعائیں دیں۔ دادی کانوں سے میری بات سن رہی تھیں لیکن ہاتھوں سے جن کی جھرّیاں بھری کھال جھول گئی تھی، دالان کے اکلوتے ثابت پلنگ کو صاف کر رہی تھیں۔ جس پر میلے کپڑے، کتھے چونے کی کلیاں اور پان کی ڈلیاں ڈھیر تھیں اور آنکھوں سے کچھ اور سوچ رہی تھیں۔ مجھے پلنگ پر بٹھا کر دوسرے جھولا جیسے پلنگ کے نیچے سے وہ پنکھا اُٹھالائیں جس کے چاروں طرف کالے کپڑوں کی گوٹ لگی تھی اور کھڑی ہوئی میرے اس وقت تک جھلتی رہیں جب تک میں نے چھین نہ لیا۔ پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ ایک تین دروں کا دالان تھا۔ بیچ میں مٹی کا چولہا بنا تھا۔ المونیم کی چند میلی پتیلیاں کچھ پیپے، کچھ ڈبے، کچھ شیشے کی بوتل اور دو چار اسی قسم کی چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ میری طرف پیٹھ کیے چولہے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ دادا نے کونے میں کھڑے ہوئے پُرانے حُقہ سے بے رنگ چلم اتاری اور باورچی خانہ میں گھس گئے۔ میں ان دونوں کی گھن گھن کرتی سرگوشیاں سنتا رہا۔ دادا کئی بار جلدی جلدی باہر گئے اور آئے۔ میں نے اپنی شیروانی اُتاری۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر چھ دروازوں والے کمرے کے کواڑ پر ٹانگ دی۔ نقشین کیواڑ دیمک چاٹ گئی تھی۔ ایک جگہ لوہے کی پتّی لگی تھی لیکن بیچوں بیچ گول دائرے میں ہاتھی دانت کا کام، کتھے اور تیل کے دھبوں میں جگمگا رہا تھا۔ بیگ کھول کر میں نے چپل نکالے اور جب تک میں دوڑوں دادا گھڑونچی پر سے گھڑا اٹھا کر اس لمبے چوڑے کمرے میں رکھ آئے جس میں ایک بھی کیواڑ نہ تھا۔ صرف گھیرے لگے کھڑے تھے۔ جب میں نہانے گیا تو دادا المونیم کا لوٹا میرے ہاتھوں میں پکڑا کر مجرم کی طرح بولے۔ ''تم بیٹے

اطمینان سے نہاؤ۔ اِدھر کوئی نہیں آئے گا، پردے تو میں ڈال دوں لیکن اندھیرا ہوتے ہی چمگادڑ گھس آئے گی اور تم کو دق کرے گی۔''

میں گھڑنے کو ایک کونے میں اُٹھا لے گیا۔ وہاں دیوار سے لگا، اچھی خاصی سینی کے برابر پیتل کا گھنٹہ کھڑا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ گھنٹے میں مونگریوں کی مار سے داغ پڑ گئے تھے۔ دو انگل کا حاشیہ چھوڑ کر جو سوراخ تھا اس میں سوت کی کالی رسی بندھی تھی۔ اس سوراخ کے برابر ایک بڑا سا چاند تھا اس کے اوپر سات پہل کا ستارہ تھا۔ میں نے تولیہ کے کونے سے جھاڑ کر دیکھا تو وہ چاند تارا بھسول اسٹیٹ کا مونوگرام تھا۔ عربی رسم الخط میں قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ'' کھدا ہوا تھا۔ یہی وہ گھنٹہ تھا جو بھسول کی ڈیوڑھی پر اعلان ریاست کے طور پر تقریباً ایک صدی سے بجتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھنے کے لیے اٹھانا چاہا لیکن ایک ہاتھ سے نہ اٹھا سکا۔ دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر دیکھتا رہا۔ میں دیر تک نہاتا رہا۔ جب باہر نکلا تو آنگن میں قاضی انعام حسین پلنگ بچھا رہے تھے۔ قاضی انعام حسین جن کی گدّی نشینی ہوئی تھی۔ جن کے لیے بندوقوں کا لائسنس لینا ضروری نہیں تھا۔ جنہیں ہر عدالت طلب نہیں کر سکتی تھی۔ دونوں ہاتھوں پر خدمت گاروں کی طرح طباق اٹھائے ہوئے آئے۔ جس میں الگ الگ رنگوں کی دو پیالیاں ''لب سوز'' لب بند جائے سے لبریز رکھی تھی۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں دو اُبلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے گئے تھے۔ شروع اکتوبر کی خوشگوار ہوا کے ریشمی جھونکوں میں ہم لوگ بیٹھے نمک پڑی ہوئی چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ دروازے پر کسی بوڑھی نے ہانک لگائی۔

''مالک''

''کون''

''مہتر ہے آپ کا ـــــ صاحب جی کا بلاوے آئے ہے۔''

دادا نے گھبرا کر احتیاط سے اپنی پیالی طباق میں رکھی اور جوتے پہنتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اپنے بھلے دنوں میں تو اس طرح شاید وہ کمشنر کے آنے کی خبر سن کر بھی نہ نکلے ہوں گے۔

میں ایک لمبی ٹہل لگا کر جب واپس آیا تو ڈیوڑھی میں مٹی کے تیل کی ڈبیا جل رہی تھی۔ دادا باورچی خانے میں بیٹھے چولھے کی روشنی میں لالٹین کی چمنی جوڑ رہے تھے میں ڈیوڑھی سے ڈبیا

اُٹھالایا اور اصرار کر کے ان سے چمنی لے کر جوڑنے لگا۔

ہاتھ بھر لمبی لالٹین کی تیز گلابی روشنی میں ہم لوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دادا میرے بزرگوں سے اپنے تعلقات بتاتے رہے۔ اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے۔ کوئی آدھی رات کے قریب دادی نے زمین پر چٹائی بچھائی اور دسترخوان لگایا۔ بہت سی اَن میل، بے جوڑ اصلی چینی کی پلیٹوں میں بہت سی قسموں کا کھانا چنا۔ شاید میں نے آج تک اتنا نفیس کھانا نہیں کھایا۔

صبح میں دیر سے اٹھا ـــــ یہاں سے وہاں تک پلنگ پر ناشتہ چنا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ دادی نے رات بھر ناشتہ پکایا ہے ـــــ جب میں اپنا جوتا پہننے لگا تو رات کی طرح اس وقت بھی دادی نے مجھے آنسو بھری آواز سے روکا۔ میں معافی مانگتا رہا، دادی خاموش کھڑی رہیں۔ جب میں شیروانی پہن چکا، دروازے پر یکہ آ گیا، تب دادی نے کانپتے ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھا، ان کے چہرے پر چونا پُتا ہوا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ انہوں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ اکاون روپے تمہاری مٹھائی کے ہیں اور دس کرائے کے۔''

''ارے ـــــ ارے دادی ـــــ آپ کیا کر رہی ہیں!'' اپنی جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو میں نے پکڑ لیے۔

''چپ رہو تم ـــــ تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں جو جس کا حق ہوتا ہے وہ دے تو دیتے ہیں ـــــ غضب خدا کا تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ اور میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے سکوں ـــــ میں ـــــ بھیّا ـــــ تیری دادی تو فقیرن ہوگئی ـــــ بھکارن ہوگئی۔''

معلوم نہیں کہاں کہاں کا زخم کھُل گیا تھا۔ وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں۔ دادا میری طرف پشت کیے کھڑے تھے اور جلدی جلدی حقہ پی رہے تھے۔ مجھے رخصت کرنے دادی ڈیوڑھی تک آئیں لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔ میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اور گردن ہلا کر رخصت کر دیا۔

دادا قاضی انعام حسین تعلقدار بھسول تھوڑی دیر تک یکہ کے ساتھ چلتے رہے لیکن نہ

مجھ سے نگاہ ملائی نہ مجھ سے خدا حافظ کہا۔ ایک بار نگاہ اٹھا کر دیکھا اور میرے سلام کے جواب میں گردن ہلا دی۔

سدھولی جہاں سے سیتاپور کے لیے مجھے بس ملتی، ابھی دور تھا۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے یکّہ کو سڑک پر کھڑی ہوئی سواری نے روک لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرا یکّہ والا ہاتھ جوڑے مجھ سے کہہ رہا تھا ــــ میاں ــــ اِلی شاہ جی بھسول کے ساہوکار ہیں، ان کے یکّہ کا بم ٹوٹ گیا ہے، آپ بُرا نہ مانو تو الی شاہ بیٹھ جائیں۔''

میری اجازت پا کر اس نے شاہ جی کو آواز دی۔ شاہ جی ریشمی کرتا اور مہین دھوتی پہنے آئے اور میرے برابر بیٹھ گئے اور یکّے والے نے میرے اور ان کے سامنے ''پیتل کا گھنٹہ'' دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر رکھ دیا۔ گھنٹے کے پیٹ میں مونگری کی چوٹ کا داغ بنا تھا۔ دو انگل کے حاشیے کا سوراخ میں سوت کی رسّی پڑی تھی۔ اس کے سامنے قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ کا چاند اور ستارے کا مونوگرام بنا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے اور یکّے والا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یکّے والے سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کا شاہ جی گھنٹہ بھی خرید لایو؟''

''ہاں کل شام معلوم نائی، کا وقت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دے دیہن بلائے کے اَلی ــــ''

''ہاں وقت وقت کی بات ہے۔ شاہ جی نا ہیں تو ای گھنٹہ ــــــ''

''اے گھوڑے کی دُم راستہ دیکھ کے چل''۔ یہ کہہ کر اُس نے چابک جھاڑا۔

میں۔ میاں کا بُرا وقت۔ چوروں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ چابک گھوڑے کے نہیں میری پیٹھ پر پڑا ہے۔

☆☆☆

احوالِ مصنف

قلمی نام : ابنِ کنول

اصل نام : ناصر محمود کمال

والد کا نام : مرحوم قاضی شمس الحسن کنولؔ ڈبائیوی

ملازمت : پروفیسر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-۱۱۰۰۰۷

تعلیم : ایم۔اے۔(مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)
ایم فل، پی ایچ۔ڈی (دہلی یونیورسٹی، دہلی)

کتابیں : (۱) تیسری دنیا کے لوگ (افسانے) (۲) بندرا سے (افسانے)
(۳) ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں (تحقیق)
(۴) داستان سے ناول تک (تنقید) (۵) ریاض دلربا (تحقیق وتدوین
(۶) آؤ اردو سیکھیں (۷) بوستان خیال ایک مطالعہ (۸) انتخابِ سخن
(۹) منتخب غزلیات (۱۰) منتخب نظمیں (۱۱) اصناف پارینہ
(۱۲) تنقید وتحسین (۱۳) تحقیق وتدوین (۱۴) باغ وبہار
(۱۵) میر امّن (۱۶) نظیر اکبر آبادی (انتخاب معہ مقدمہ)
(۱۷) پہلے آپ

غیر ملکی سفر : امریکہ، انگلینڈ، ماریشس، سعودی عرب، پاکستان، متحدہ عرب امارات

Urdu Afsana

by

Prof. Ibne Kanwal

Department of Urdu,
Delhi University, Delhi

Kitabi Duniya

1955, Turkman Gate, Delhi - 110006 (INDIA)
Mobile: 9313972589, Phone: 0091-11-23288452
E-mail : kitabiduniya@rediffmail.com

ISBN: 978-93-80919-24-9